فانوسِ خیال

★

FANOOS-I-KHAYAL

1957

سب کی پسند

مولانا لنگیاں

استعمال کیجئے

جو اپنی بے مثل خوبیوں کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہیں

ہول سیل اور ریٹیل کا مرکز

مولانا کمپنی (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۵۲ - انگپا نائیک اسٹریٹ - پوسٹ بکس نمبر ۲۹۲

مدراس ۱

فانوس خیال

۱ ۳ ۵ ۷ ۶

سالنامہ

اے، جے، اردو سیمینار

مدیر ـ اے۔ جے۔ جلال الدین بی۔ اے   جلد چہارم

فہرستِ مضامین

رفتارِ زمانہ

بحمد اللہ فانوس خیال کا یہ چوتھا شمارہ اس وقت برسرِ عام ہو رہا ہے جبکہ ہمارے ملک کی پہلی جنگِ آزادی کی یادگار منائی جانے والی ہے۔ ہندوستان کی زبانوں میں جہاں تک ہمارا خیال ہے اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس نے اس پہلی جنگِ آزادی سے کافی اثر لیا اور اس کی جد و جہد میں اس زبان کا نمایاں حصہ رہا۔

پہلی جنگ آزادی سے پہلے ہی اردو صحافت نگاری کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اس کے رسالے دبی زبان سے ہی سہی حکومت سے بیزاری کا اظہار کرنے لگے تھے۔ جس کی پاداش میں سید محمد باقر، محمد حسین آزاد کے والدِ بزرگوار کو سولی پر چڑھنا پڑا۔ مادرِ وطن کی آزادی کے لئے جن سپوتوں نے اپنا خون بہایا ان میں یہ بزرگ پہلا مظلوم ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ جو اب تک تاریخ میں غدر کے نام سے یاد کی جاتی تھی اردو زبان کی ترقی میں ایک سنگِ میل ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ہی حکومت کی زبان فارسی کے بجائے اردو ہو گئی۔ اردو صحافت نگاری کو فروغ ہوا۔ نظم کے علاوہ نثر کی طرف بھی توجہ کی جانے لگی اور سو سال کے اندر اندر ہی اس نے وہ ترقی حاصل کی کہ اس کا شمار دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں سے ہونے لگا ہے۔ اس کا ادب دوسری اور زبانوں کے ادب سے کسی طرح کم نہیں۔ آج یہ زبان بین الاقوامی حیثیت کی دارا ہو چکی ہے۔ گو آج ہمارے ملک میں اس کے لئے بظاہر فضا مخالف معلوم ہوتی ہے پھر بھی ہم کمال وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس زبان میں وہ سکت ہے کہ وہ ہر مخالفت کو دور کر کے اپنے لئے سلامت روی کا راستہ پیدا کر ہی لے گی۔

فانوس خیال کو امسال بھی ڈاکٹر مولوی الحاج عبدالحق صاحب نے اپنے ارشادِ گرامی سے نوازا ہے۔ آپ نے جنوبی ہندوستان کی شعوری کیفیت کو جگانے اور ان کا علمی اور ادبی ذوق بڑھانے کے لئے کافی خدمات انجام دئے ہیں۔ اب آپ کی توجہ جنوبی ہند کی ان عظیم المرتبت ہستیوں کی طرف ہوئی ہے جنہوں نے اپنے ایثار و کرم سے ملک کے اس خطہ کی شان بڑھائی۔

سوانح نگاری داستان گوئی نہیں ہے۔ اس کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے اس کے ذریعہ معاشرہ کو کسی خاص شخصیت سے آگاہ کروایا جاتا ہے تاکہ معاشرہ کے افراد ان اوصافِ حمیدہ سے اپنے آپ کو متصف کر سکیں۔ پلوٹارک نے مغربی قوموں میں جوش، ولولہ، جرأت اور اولوالعزمی اسی فن کے ذریعے پیدا کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ نے فانوس خیال کے تیسرے شمارہ میں مولوی عبدالسبحان صاحب مرحوم کی یاد تازہ فرمائی

تھی۔ اور اس شمارہ میں حاجی جمال محمد مرحوم کا ذکرِ خیر فرمایا ہے۔ ماضی کے نقوش کو الفاظ کے نگینے میں اس خوبی سے سمونا ڈاکٹر صاحب قبلہ کا ہی کام ہے ہم اس سلسلہ میں غالب کا ایک مصرعہ ذراسی ترمیم کے ساتھ بہرحال پیش کر دیتے ہیں۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں تیرا

مولوی الحاج سید عبدالوہاب صاحب بخاری نے امام غزالی کا تذکرہ فرمایا ہے جو قارئین کے لئے نہایت ہی مفید اور دلچسپ ثابت ہوگا۔

جناب ضیا فتح آبادی نے دورِ جنوبی ہند میں اردو کے سلسلہ کو بحال رکھا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی نظم بعنوان 'جنگ آزادی کے بے نام شہید' وقت کی مناسبت کی حامل اور نہایت ہی دلچسپ ہے۔

جناب رمیش پال (آل انڈیا ریڈیو) جناب مرزا عباس علی صاحب عباس، جناب صفدر حسین صاحب ایم اے، ایل، ٹی، جناب حیدر علی خاں صاحب ایم اے، ایل، ٹی، جناب محبوب بادشاہ صاحب محبوب اور دیگر ادیبوں نے بھی اپنے عطیہ جات سے ہمیں نوازا ہے۔ ہم ان سب کے تہِ دل سے شکرگذار ہیں۔

فانوسِ خیال میں اشتہار دینے والے حضرات کے ہم بالخصوص شکرگذار ہیں کیونکہ ان ہی کے تعاون نے اس رسالہ کی اشاعت کو آسان بنایا۔ یعنی آئندہ اشاعتوں کے لئے بھی ہماری امید ان ہی حضرات سے بندھی ہوئی ہے اور ہمیں اس امر کا یقین ہے کہ ان کے تعاون کے سبب کبھی اس کام میں ہم مشکل محسوس نہیں کریں گے۔

ہم ہز اکسیلنسی سری شری پرکاسا سابق گورنر مدراس اور فی الحال گورنر بمبئی کے نوازشاتِ بے پایاں کا مودبانہ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ آپ جب تک مدراس میں تشریف رکھتے تھے۔ اے سے جے۔ اردو سیمینار آپ کی توجہ اور عنایت کا مرکز رہا۔ یہاں سے تشریف لیجانے کے بعد بھی آپ اس ادارہ کو بھولے نہیں۔ اس کی اعزازی سرپرستی قبول فرمائی ہے اور اپنا فوٹو عنایت کرکے فانوسِ خیال کو مزین ہونے کا موقع عطا فرمایا ہے۔ یہ ادارہ آپ کی ذاتِ والاصفات و گرامی مرتبت کا ہر طرح ممنونِ منت ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا آپ کے سایۂ عاطفت کو ہمارے ملک کی ادبی دنیا کے لئے محفوظ رکھے۔ آمین۔

اے۔ جے۔ اردو سمینار کی چوتھی سالانہ روداد

مرزا غالب نے نہایت ہی سچی بات بتائی ہے کہ

"توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے"

مگر یہ ہمارا ایمانِ راسخ ہے کہ ہمت اور توفیق یہ دونوں باتیں خدا ہی کی جانب سے عطا ہوتی ہیں۔ اس لئے ہم اپنی چوتھی سالانہ روداد پیش کرنے سے پہلے توفیق کے عطا کرنے والے اور ہمتوں کے بڑھانے والے خدائے قدوس کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور دست بدعا ہیں کہ اپنے حبیب کے صدقہ میں وہ اس ادارہ کے مقاصد کے حصول کے لئے ہمیں مزید توفیق و ہمت عنایت فرماتا رہے۔

یہ ادارہ موسوم بہ اے۔ جے۔ اردو سمینار جناب اے۔ زین العابدین مرحوم کے نام سے معنون ۲۶ر اپریل ۱۹۷۳ء میں قائم ہوا۔ اس چار سال کی قلیل مدت میں اس ادارہ نے کافی ترقی کی ہے جس سے کام کرنے والوں کے حوصلے بہت وسیع ہو چکے ہیں۔

سال زیرِ روداد کی کارروائی کا افتتاح ریاستِ مدراس کے ماہرِ تعلیمات اور مدراس یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سر اے۔ لکشمنا سوامی مدلیار نے فرمایا۔ افتتاح کے موقع پر تقریر فرماتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ اگر کسی زبان کو دنیا میں مشہور کرنا ہے تو ترجمہ کا کام بہت ضروری ہے۔ ہم اپنے بہترین ادب کا ترجمہ دنیا کی مشہور زبانوں میں کریں۔ اور دیگر اقوام کو اپنے ادب سے روشناس کرائیں اور دیگر زبانوں کے بہترین ادب کے ترجموں سے اپنے ادب کو مالامال کریں۔ پھر فاضل مقرر نے مدراس یونیورسٹی کے خلیقانہ روایات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ منجملہ ان روایات کے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اربابِ جامعہ کسی زبان سے کدورت یا منافرت نہیں رکھتے بلکہ ہر زبان کی ترقی کے لئے برابر کوشش کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اردو کو جو جائز مقام یونیورسٹی میں ہے وہ کسی طرح کم نہیں ہوگا۔ صاحبِ موصوف نے ضمناً ڈاکٹر الحاج عبدالحق صاحب اور پروفیسر الحاج سید عبدالوہاب صاحب بخاری کا شکریہ ادا فرمایا کہ ان دو حضرات نے اردو عربی اور فارسی زبانوں کی تدریس کے لئے یونیورسٹی کو اپنی صائب رائے سے کبھی دریغ نہیں فرمایا۔

پروفیسر الحاج سید عبدالوہاب صاحب بخاری صدر اے۔ جے۔ اردو سمینار نے جلسہ کی ابتدا میں فاضل مقرر اور دیگر مہمانوں کا خیر مقدم فرمایا۔

ڈاکٹر الحاج عبدالحق صاحب نے معزز مہمان کی تعلیمی خدمات کا تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا۔

محمد رضا خان صاحب یم۔ یل۔ سی نے حاضرین کو آگاہ کیا کہ ہم حکومت سے اپنے مطالبات جہاں تک ہو سکے کم کریں اور اپنے مسائل کے حصول کے لئے خود زیادہ متوجہ ہوں تو یہ طریقہ نہایت مستحسن ہوگا

مدرسۂ زین العابدین کا سالانہ جلسہ

یہ جلسہ بروز پنجشنبہ ۸ نومبر ۱۹۵۶ء شام کے ۶ بجے زیر صدارت عالی جناب جسٹس بشیر احمد سعید سمینار ہال بی، وی۔ ایئر اسٹریٹ میں منعقد ہوا۔ یہ مدرسہ عربی اور اردو پڑھانے کے لیے ۲۷ اگست [illegible]ء میں قائم ہوا۔ اس مدرسہ میں دو اساتذہ ہیں جو اپنے فرائض تشفی بخش طور پر انجام دیتے ہیں۔ جلسہ قرأت قرآن مجید سے شروع ہوا جس کے بعد معتمد نے سالانہ کارروائی کی روداد سناتے ہوئے بیان کیا کہ اس مدرسہ میں کل ۱۱۷ طلبا اور ۵۸ طالبات ہیں اور مدرسہ کی اوسط حاضری ۸۰ فی صد سے کچھ زیادہ ہے۔ ان کے علاوہ بالغین بھی قرآن شریف اور فقہ کا درس حاصل کرتے ہیں۔

معتمد نے یہ بھی اعلان کیا کہ سال زیرِ روداد میں ۸ طلبا نے قرآن شریف ختم کیا۔ روداد ختم کرتے ہوئے معتمد نے ان سہولتوں کا ذکر فرمایا جو مدرسہ کی جانب سے طلباء کے لئے فراہم ہوتی ہیں۔ آخر میں یہ روداد اہلِ محلہ سے پرزور اپیل پر ختم ہوئی کہ وہ اس مدرسے سے ہر طرح فائدہ اٹھائیں۔

مولوی الحاج سید عبدالوہاب صاحب بخاری نے جسٹس بشیر احمد سعید صاحب اور دیگر مہمانوں کا خیر مقدم فرماتے ہوئے جسٹس صاحب کی تعلیمی خدمات کا صراحت سے ذکر فرمایا۔

ڈاکٹر الحاج عبدالحق صاحب نے اس مدرسہ کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی اور ارشاد فرمایا کہ اس زمانے میں اس امر کی ضرورت ہے کہ اس طرح کے اور کئی مدرسے کھولے جائیں تاکہ ان مدرسوں سے زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔

پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا سابق اردو پروفیسر نظام کالج نے نہایت ہی سلیس اور دل آویز اردو میں مدرسہ کے بچوں کو خطاب فرمایا اور انہیں اسلاف کے روایات سے سبق حاصل کرکے اوصاف حمیدہ اختیار کرنے کی نصیحت فرمائی۔

آنریبل جسٹس بشیر احمد سعید صاحب صدرِ جلسہ نے حسبِ درخواست صدر اپنے جے۔ اردو سمینار مدرسہ کے مختلف مقابلوں میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبا کو انعامات تقسیم فرمائے اور پھر حاضرین کو خطاب فرمایا۔ فاضل صدر نے تعلیم کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرنے کے بعد یہ واضح فرمایا کہ ان سب شعبوں میں ہماری برابر کی ترقی لازمی ہے۔ آپ نے حاضرین کو اس امر سے بھی آگاہ کیا کہ وہ مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کی طرف بھی خاص توجہ فرمائیں۔

جناب بین محمد یوسف صاحب بی اے رکن مجلس منتظمہ نے جناب صدر اور دیگر حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

مدرسہ میں انعام پانے والوں کی فہرست حسبِ ذیل ہے۔

قرأت قرآن مجید

(۱) عبدالہادی

(۲) سید حفظ الرحمٰن

(۳) محمد عثمان

دعائیہ نظم
(۱) سید امان اللہ
(۲) عبدالقدوس
(۳) عبدالعلیم
(۴) رحمت النسا بیگم
(۵) حورالنسا بیگم
(۶) زینت النسا بیگم
(۷) حسینہ بیگم

تلاوت قرآن مجید
(۱) امان اللہ
(۲) عبدالصمد
(۳) عبدالقدوس
(۴) رحمت النسا بیگم
(۵) عارف النسا بیگم

خوشنویسی
(۱) عبدالقدوس
(۲) قادر محی الدین
(۳) عبدالہادی
(۴) طاہر النسا بیگم
(۵) رحمت النسا بیگم
(۶) حورالنسا بیگم

حاضری
(۱) عبدالہادی
(۲) محمد عثمان
(۳) صفیہ بی
(۴) ریحانہ بی

ابتدائی جماعت
(۱) خواجہ شاہ محمد ناظم الدین
(۲) عبداللطیف
(۳) صابر النسا
(۴) اختر جان

اے۔جے۔ اردو سمینار کی رکنیت
سر دست اس کے ۲۰۴ رکن ہیں۔ پچھلے سال ہم نے بڑی مسرت کے ساتھ اس امر کا اعلان کیا تھا کہ جناب حاتم یم لودھگار صاحب ہمارے لائف ممبر ہو چکے ہیں اس سال بھی ہم اسی مسرت کے ساتھ قارئین کے گوش گذار کرنا چاہتے ہیں کہ صاحب موصوف کے علاوہ حسب ذیل حضرات ہمارے لائف ممبر اور پیٹرن ممبر ہو چکے ہیں۔

لائف ممبر
(۱) جناب حسن علی ڈھالہ صاحب تاجر چرم
(۲) جناب یم۔ عبدالسلام صاحب
(۳) جناب یم۔ عبدالغنی صاحب

پیٹرن ممبر
(۱) الحاج یم حیات بادشاہ صاحب (ملنگ ٹریڈنگ کمپنی۔ بڑیمیٹ، مدراس)

ہم ان سب حضرات کی خدمت میں دلی ہدیہ تشکر پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ان گرامی حضرات نے اس ادارہ سے متعلق جو عمدہ مثال قائم کی ہے آپ کی دیگر احباب زیادہ سے زیادہ تاسی فرمائیں گے۔ اور اس طرح اپنی اردو دوستی کا ثبوت بہم پہنچائیں گے

اے۔ جے۔ اردو سمینار لائبریری

اس وقت سمینار لائبریری میں مختلف علوم پر ۱۲۵۰ کتابیں موجود ہیں۔ یہ سب کتابیں زیادہ اردو میں ہیں۔ ذخیرۂ کتب میں علاوہ اس اضافہ کے جو سمینار کی جانب سے وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ بعض معاونین نے عطیۂ کتب یا مخصوص عطیہ برائے کتب کے ذریعے سے مزید اضافہ فرمایا ہے ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

(۱) جناب حاجی یم اے شکور صاحب
(۲) جناب کمال بادشاہ صاحب
(۳) مینجر کتابی دنیا لکھنؤ
(۴) جناب عبدالشکور سیٹھ صاحب
(۵) جناب معتشم صاحب
(۶) جناب حاجی محمد عباس صاحب
(۷) جناب نصیرالدین ہاشمی صاحب
(۸) جناب یس یم۔ عبدالرحمن صاحب
(۹) جناب پی۔ عبدالقدوس صاحب
(۱۰) جناب شیخ احمد صاحب
(۱۱) جناب یس۔ ابراہیم صاحب
(۱۲) جناب کے۔ یم سلیم صاحب
(۱۳) جناب جی۔ یم۔ مراد علی صاحب
(۱۴) پروفیسر حیدر علی خاں صاحب حیدر

ہم ان سب حضرات کے فرداً فرداً شکرگذار ہیں اور امیدوار ہیں کہ لائبریری کی یہ خوشگوار روایت پائندہ رہے گی۔

اے۔ جے۔ اردو سمینار کی امدادی کمیٹی

ہمارے شہر کے وہ نوجوان جو سمینار کی کارروائیوں میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں انھیں اس ادارہ کی زندگی سے زیادہ قریب کرنے کی غرض سے پچھلے سال ان حضرات کی ایک کمیٹی موسوم بہ اے۔ جے۔ اردو سمینار ایکسیلری کمیٹی مقرر ہوی یہ کمیٹی نہ صرف ادارہ کی سالانہ کارروائیوں میں اس کی مدد کرتی ہے بلکہ دیگر کارروائیوں سے سمینار کی رپورٹ کو اور زیادہ شاندار کرتی ہے۔

اس کمیٹی کے دو عہدہ دار ہیں۔ ایک جناب حبیب اللہ بادشاہ صاحب ایم اے، بی، یل ناظم شعبۂ ادبی۔ دوسرے جناب میر اسد علی صاحب بی اے ناظم شعبۂ ثقافتی

جلسۂ میلاد النبی

جناب میر اسد علی صاحب بی اے ثقافتی امور کے ناظم نے اے۔ جے۔ اردو سمینار امدادی کمیٹی کی جانب سے بروز جمعہ بتاریخ ۹ نومبر ۱۹۵۶ء شام کے ۶½ بجے جلسۂ میلاد النبی منعقد کیا۔ اس مبارک جلسہ کی صدارت سمینار کے صدر سیادت مآب مولوی الحاج سید عبدالوہاب صاحب بخاری نے فرمائی۔ عالی جناب نانان سنگھ صاحب اسسٹنٹ کلکٹر آف کسٹم، پروفیسر چندراسیکھرا ایئر ناظم قلمی کتب خانۂ حکومت مدراس، جناب رحمت اللہ سیٹھ صاحب بی اے۔ جناب محمد امین الدین صاحب ایم اے۔ اراکین مجلس منتظمہ اے جے۔ اردو سمینار اور جناب حبیب اللہ بادشاہ صاحب ایم، اے، بی یل نائب معتمد اے جے۔ اردو سمینار نے اپنی پر معنی تقریروں سے حاضرین کو محظوظ اور مستفید فرمایا۔

جناب نانان سنگھ صاحب نے اسلام کے وہ محاسن

بیان کئے جنہیں اپنانے پر آج زمانہ مجبور ہوگیا ہے
جیسے بیوگوں کے لئے نکاح ثانی، ترکہ کی تقسیم میں
عورتوں کا حصہ۔ شراب نوشی کی مناہی وغیرہ۔ آپ
نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے اپنی اعلیٰ سیرت کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرکے
زندگی کی اعلیٰ قدروں کو واضح فرمایا۔ آپ نے دعوے
کے ساتھ فرمایا کہ غیر مسلم حضرات اگر قرآن شریف
پڑھیں اور سمجھیں تو وہ بدگمانیاں جو اکثر حضرات کو
اسلام اور بانیٔ اسلام سے ہیں خود ہی دور ہوجائیں گی
اس کے لئے آپ نے حضرت عمر رض کی زندگی سے تاریخی
شہادت پیش کی۔ حضرت عمر رض اول اول اسلام اور بانیٔ اسلام
کے سخت دشمن تھے مگر جب انھوں نے قرآن شریف کی چند آیتیں پڑھیں
تو فوراً متاثر ہوئے اور اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے

جلسے کے اختتام پر جناب میر اسد علی صاحب
بی۔اے نے معزز مہمان جناب نانان سنگھ، شری
چندرا سیکھارا ایئر، دیگر مقررین و حاضرین کا شکریہ
ادا کیا۔

"اے۔ زین العابدین شیلڈ" تقریری مقابلہ

جناب حبیب اللہ بادشاہ صاحب نائب معتمد اور
ناظم شعبۂ ادبی نے اے۔جے اردو سمینار اکسیلری
کمیٹی کی جانب سے یس۔آئی۔ای۔ٹی ویمنز کالج
مدراس میں بروز جمعہ بتاریخ ۸ ر فروری ۱۹۵۶ء ایک
تقریری مقابلہ منعقد کیا۔ یہ مقابلہ صرف کالج کے طلباء
اور طالبات کے لئے تھا

ہر کالج کی جانب سے حسب ہدایت دو دو امیدوار
بھیجے گئے۔ حسب ذیل کالجوں نے اس مقابلہ میں حصہ لیا۔

(۱) پریسیڈنسی کالج۔ مدراس
(۲) گورنمنٹ آرٹس کالج۔ مدراس
(۳) یس۔ائی۔ای۔ٹی ویمنز کالج مدراس
(۴) جمال محمد کالج۔ ترچناپلی

اس جلسہ کے صدر مولوی الحاج سید عبدالوہاب
صاحب بخاری اور منصفین
(۱) محترمہ خورشید بیگم صاحبہ ایم۔اے۔ یل۔ٹی۔
اسسٹنٹ لکچرار اردو کوئن میریز کالج مدراس
(۲) افضل العلماء مولوی رحیم احمد فاروقی ایم۔اے
لکچرار (عربی) گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس
(۳) عالی جناب سید محمد فضل اللہ صاحب ایم۔اے۔یل۔ٹی
لکچرار (اردو) گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس تھے

حسب ذیل مسئلہ زیر بحث تھا
"اس ایوان کی رائے میں امن عالم کے لئے دنیا میں
ایک حکومت ہونی چاہئے"

منصفین کی رائے میں تقریروں کا معیار کافی
اونچا تھا۔
(۱) محترمہ بی بی جان صاحبہ یس، آئی، ای، ٹی
کالج مدراس نے پہلا انعام (سلور کپ) پایا۔
(۲) جناب محمد اختر سعید صاحب جمال محمد کالج ترچناپلی
نے دوسرا انعام (سلور کپ) پایا۔

یس۔آئی۔ای۔ٹی ویمنز کالج کے دونوں امیدوار
کے نشان چونکہ اور کالجوں کے امیدواروں سے بہتر
ثابت ہوئے۔ اس لئے اے۔ زین العابدین رولنگ شیلڈ
اس کالج کو ملا۔

جناب صدر نے خاص طور پر انعام پانے والوں اور

عام طور پر سب امیدواروں کو تقریری مقابلے کے معیار کو کامیابی اور بلند کرنے پر مبارکباد دی۔ آپ نے مصنفین کا بھی سیمینار کی جانب سے شکریہ ادا فرمایا۔

جناب حبیب اللہ بادشاہ صاحب بی اے۔ بی ایل ناظم شعبۂ ادبی نے جناب صدر محترم مصنفین، مقررین اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

ہم اس موقع پر پریس۔ ای۔ ای۔ ٹی ڈیمنز کالج کو شیلڈ اور پہلا انعام حاصل کرنے پر اور جمال محمد کالج کو دوسرا انعام حاصل کرنے پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ آئندہ سال زیادہ کالج اس مقابلہ میں حصہ لیں گے۔

اے۔ جے۔ اردو سیمینار کا چوتھا سالانہ مشاعرہ

حسب دستور گذشتہ سال بھی اے۔ جے اردو سیمینار کا سالانہ مشاعرہ نہایت ہی کامیاب رہا یہ مشاعرہ ۲۸ / ۱۹۵۶ء جنوری کو راجہ انامطے ہال میں منعقد ہوا۔ اس مشاعرہ کی صدارت عالیجناب ڈاکٹر یم۔ عبدالحق صاحب نے فرمائی۔ جناب الحاج سید عبدالوہاب صاحب بخاری صدر اے۔ جے اردو سیمینار نے صدر محترم، شعرائے کرام اور حاضرین کا خیر مقدم کیا اس مشاعرہ کی تفصیلی روداد اس شمارہ کے کسی اور صفحہ پر مندرج ہے۔

جلسۂ تہنیت

ہم انتہائی مسرت کے ساتھ اپنے قارئین کو یہ اطلاع دینا چاہتے ہیں کہ اے۔ جے۔ اردو سیمینار کے محترم صدر مولوی الحاج سید عبدالوہاب صاحب بخاری امسال بھی عازم حج بیت اللہ ہورہے ہیں۔ آپ کے ساتھ جناب اے۔ جے۔ جلال الدین صاحب بی اے۔ معتمد ثانی اے جے اردو سیمینار۔ جناب ذکی الدین احمد صاحب رکن مجلس منتظمہ، جناب الحاج محفوظ الحق صاحب رکن مجلس امدادی (اگزیکیلری کمیٹی)، خلف الرشید علامہ الحاج عبدالحق صاحب اور جناب الحاج ٹی۔ آر عبدالعظیم صاحب رکن اے جے اردو سیمینار بھی یہ مبارک سفر اختیار کررہے ہیں۔ اسی سلسلہ میں بتاریخ ۲۷ مارچ ۱۹۵۶ء سیمینار ہال میں ایک جلسہ زیر صدارت جناب کے۔ عبدالکریم صاحب منعقد ہوا۔ جناب صدر نے اس مبارک جلسہ کی غرض وغایت بیان کی۔

عالی جناب صفدر حسین صاحب ایم۔ اے، ایل، ٹی اردو لکچرار گورنمنٹ آرٹس کالج سیشر اے جے۔ اردو سیمینار کی جانب سے اس متبرک جماعت کو عازم حج ہونے پر مبارکباد پیش کی۔

اس مبارک موقع پر پروفیسر حیدر علی خان صاحب اور جناب حبیب اللہ بادشاہ صاحب نے بھی تقریر فرمائی۔

مولوی الحاج سید عبدالوہاب صاحب بخاری نے اپنی اور دیگر عازمین خاص کی جانب سے اراکین سیمینار کا شکریہ ادا کیا۔ آپ نے اس ادارہ اور ادارہ کے اراکین کے لئے دعائے خیر فرمائی۔

جناب سی۔ کے۔ ابراہیم بی اے۔ (آنرس) خازن نے حاضرین کرام کا بزبان اردو شکریہ ادا کیا۔

معزز مہمانوں کی تشریف آوری۔

عالی جناب حامد الانصاری صاحب غازی مدیر جمہوریت دیکلی بمبئی اکتوبر ۱۹۵۶ء مدراس تشریف لائے اور جناب محتشم عبدالغنی صاحب رکن مجلس امدادی

ملت ہے۔ اردو سمینار کی وساطت سے ۱۴ر اکتوبر کو سمینار لائبریری تشریف فرما ہوئے۔ سمینار کی شاندار لائبریری دیکھنے اور اس کی گوناگوں کارروائیوں سے واقف ہونے کے بعد آپ نے اپنے تاثرات "وزیٹرس بک" میں اس طرح قلمبند کئے ہیں۔

"برادر عزیز محتشم عبدالغنی صاحب نے رہنمائی فرمائی اور میں لے۔ جے۔ اردو سمینار کے ایوان ادب تک پہنچ گیا۔ مبارک ہیں وہ لوگ جنہوں نے سمینار کی بنا میں حصہ لیا۔ سلام ان لوگوں پر جو اس ادبی ادارے کے عروج اور ترقی کی روح رواں ہیں

جنوبی ہند میں اور مدراس ایسے شہر میں وہ کام انجام پایا جس کے لئے کبھی دہلی اور لکھنؤ کو ناز تھا۔ آج دلی، دلی نہ رہی۔ لکھنؤ لکھنؤ نہ رہ سکا۔ ایسی حالت میں ادب کی مشعل کو مدراس نے اپنے ہاتھ میں لے کر سنبھال لیا۔

لے۔ جے۔ جلال الدین صاحب کی تعریف کے لئے ادب کے ذخیروں میں الفاظ نہیں ملتے۔ میر، غالب، ذوق۔ مومن۔ سرشار۔ چکبست اور سپرو کی زبان [illegible] نہیں کرسکتی۔ مدراس نے لے۔ جے۔ اردو سمینار قائم کرکے اس کا کافی ثبوت دیا ہے۔ وقت آنے پر یہ ادارہ شمالی ہند کی رہنمائی کرے گا اور مدراس کو اردو کی راجدھانی بننے کا فخر حاصل ہوگا۔ ادارہ کے تمام رکن مخلص اور باسلیقہ ہیں اور ملک کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

بتاریخ ۱۸ر اکتوبر [illegible] مولوی عمران خاں صاحب [illegible] سمینار لائبریری [illegible] تشریف لائے [illegible]

کو خطاب فرمایا۔ لائبریری دیکھی اور "وزیٹرس بک" میں اس طرح رقم طراز ہوئے۔

لے۔ جے۔ سمینار مدراس میں مجھے حاضری کا موقع ملا اس کے مخلص بانی اور کارکنوں سے ملاقات اور گفتگو کا موقع ملا۔ تعلیمی شعبہ اور کتب خانہ کی کارگزاری دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ جنوبی ہند میں اردو کی خدمت جو مخلص بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے سر پر ہے ان کا گراں مایہ اور ہر دل عزیز ورثہ خدا کرے ان نوجوانوں کو حاصل ہو، جو ہمت کے ساتھ ناموافق حالات میں اس کی خدمت کر رہے ہیں۔ مخلص ساتھیوں اور کارکنوں کا یکجا جمع ہونا ایک بڑی نعمت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان نوجوان دوستوں کو جو باہمت اور مخلص ہیں اقبال کا یہ پیغام یاد دلا دوں۔

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول
کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز گرمئ محفل نہ کر قبول

دلی دعا اور تمنا ہے کہ اللہ پاک ان نوجوانوں کے خدمات کو قبول فرمائے۔

۱۲ر دسمبر [illegible] کو ڈاکٹر میر نظام الدین صاحب ریٹائرڈ پرشین پروفیسر اور صدر شعبۂ اسلامیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد پروفیسر سروری کی معیت میں سمینار ہال تشریف لائے۔ اس وقت مدرسۂ زین العابدین میں کمسن طلباء وطالبات قرآن شریف کا درس لے رہے تھے اس سے پروفیسر سروری اور ڈاکٹر نظام الدین صاحب حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے

تاثرات اس طرح قلمبند کئے ہیں۔

آج شام میں نے اردو سیمینار دیکھنے کا موقعہ ملا۔ یہ جان کرکے بے حد مسرت ہوئی کہ ہمارے ملک کے نوجوان جلال الدین صاحب نے اپنے والد مرحوم کی یادگار میں یہ کتب خانہ اور مدرسہ انعقاد کیا ہے۔ جو چیز مجھے بے حد پسند آئی وہ تلاوت و درس قرآنی کی صدائیں اور معصوم نونہالوں کی دینی تعلیم اور زبان دانی کی مشق ہے۔ پرانے مکاتب مدارس جن کے لئے مدرسہ ہائے نظامیہ بغداد و بخارا مشہور ہیں۔ ان کی طرز پر اس سیمینار میں ابتدائی تعلیم دی جا رہی ہے جو ملک کے لئے انتہائی خوش آئند بات ہے اور مسلمانوں کی اصلاح و فلاح کے لئے ممد معاون ہے۔ یہ بھی دیکھ کر خوشی ہوئی کہ فانوس خیال اسی ادارہ کی پیداوار ہے جس میں ملک کے مشہور صاحبانِ قلم حصے لے رہے ہیں۔ میں اس ادارے کے منتظمین کو مبارکباد دیتا ہوں اور اس ادارہ کی دن دونی اور رات چوگنی ترقی کا خداوند عالم سے خواستگار ہوں۔ شہر مدراس کے لئے یہ ایک باعثِ فخر مکتبہ ہے۔

اوپر یہ ذکر ہوا ہے کہ مدرسۂ زین العابدین کے سالانہ جلسے کے لئے ہمارے محترم کرمفرما عالیجناب جسٹس بشیر احمد سعید صاحب اور پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا دہلوی تشریف لائے تھے۔ جلسے کے اختتام پر ان دونوں بزرگوں نے سیمینار کی کارروائی سے متعلق اپنے گراں بہا خیالات "وزیٹرس بک" میں قلمبند کئے ہم ان بیش بہا خیالات سے ناظرین کو بھی آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔

عالیجناب جسٹس بشیر احمد سعید صاحب:-

"خوشی کا مقام ہے۔ جلال الدین صاحب نے جس گراں قدر تعلیمی کام کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ میں اس کے لئے تحسین و ستائش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ کی خدمات اسلام اور ملک کے لئے نہایت ہی گراں قدر ہیں اور آپ کی مثال ان سب لوگوں کے لئے قابلِ تاسی ہے جو اس طرح کی خدمت کے لئے دولت اور ذرائع رکھتے ہیں۔

جلال الدین صاحب نے اپنے باپ کے نام سے جو عربی مدرسہ ایجاد کیا ہے وہ مدرسہ محیر العقول ترقی کر رہا ہے۔ اس ترقی پر صاحب موصوف ہزارہا مبارکباد کے قابل ہیں۔ وہ اس ترقی کے لئے انتہائی ایثار سے کام لے رہے ہیں اور اس میں کافی انہماک ظاہر کر رہے ہیں اس مدرسہ کے ذریعہ دورِ حاضر کی ایک نہایت ہی اہم ضرورت پوری ہو رہی ہے یعنی اس میں قوم کے وہ نونہال دینی اور دنیوی تعلیم پا رہے ہیں جو آگے چل کر ہمارے ملک کے ذمہ دار شہری بنیں گے۔

میں دعا کرتا ہوں کہ جلال الدین صاحب اور ان کے ساتھیوں کو خدا اپنی برکتوں سے سرفراز فرمائے اور دین و دنیا کی نعمتیں عنایت فرمائے۔ آمین"

پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا (دہلوی):-

"آج کا دن میرے لئے مبارک ہے کہ مجھے اردو سیمینار کے جلسے میں دعوت دی گئی ہے۔ جلال الدین صاحب مسلمانانِ ہندوستان کے نوجوانوں کے لئے قابل تقلید مثال ہیں کہ جنہوں نے اپنے محبوب و معزز مرحوم والد کی یادگار اس خوبی سے قائم کی ہے کہ جب تک یہ زبان ہندوستان میں باقی ہے۔ یہ یادگار بھی باقی رہے گی اور ان کے مرحوم والد قبلہ کی روح جنت الفردوس میں اپنے فرزند رشید کی اس کارگذاری سے خوش

رہے گی۔ ان کے مشیر بھی قابلِ صد ستائش ہیں کہ انہوں نے بہت خوب مشورہ دیا ہے۔ اور ان کے معاون دوست جو اس نیک کام میں ان کا ہاتھ بٹا رہے ہیں قابلِ صد مبارکباد ہیں۔ اللہ پاک ان کے نیک ارادوں اور کاموں میں برکت عطا فرمائے۔ ایسا ان چھوٹے چھوٹے بچوں اور بچیوں سے کیسا کچھ بھر رہا تھا جو تعلیم حاصل کرنے اپنے گھروں سے آتی ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ محلہ اور اس محلہ کے رہنے والے جہاں اس خوبی کا کام ہو رہا ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ میری دلی دعا اور تمنا ہے کہ یہ اردو کا ادارہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے اور دکن اور ہند اور جہاں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں اس ادارے پر اردو بولنے والے اور ہندوستان کی یکجہتی کے تمنائی اس پر فخر کریں اور زین العابدین صاحب مرحوم کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں۔ افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق جو اپنے زمانے کے سرسید ہیں اور بخاری صاحب (عبدالوہاب) اللہ پاک ان دونوں کو ہندوستان میں سلامت رکھے کہ اپنے ملک اور اس ملک کے باشندوں کی خاموش خدمت کر رہے ہیں اور نوجوانوں میں نیک کاموں کی رغبت پیدا کر رہے ہیں۔ خداوند عالم ان کو اور ان کے ساتھیوں اور ان کے مشوروں پر چلنے والوں کو عمرِ نوح اور بختِ سکندر عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

روسی پروفیسر کی تشریف آوری

دسمبر ۱۹۷۶ء میں مدراس میں ایک تعلیمی نمائش حکومتِ روس کی جانب سے منعقد ہوئی۔ اس نمائش کے منتظمین روس کے ماہرِ تعلیمات تھے۔ ان ماہرین میں ایک صاحب پروفیسر گوروف اردو کے پروفیسر تھے۔ آپ ماسکو یونیورسٹی سے متعلق رہیں۔ باوجود اس کے کہ اردو زبان آپ کے لئے بالکل اجنبی زبان ہے۔ جس کا مزاج آپ کی مادری زبان سے بالکل الگ ہے۔ پھر بھی پروفیسر صاحب نے اس زبان میں کافی مہارت پیدا کر لی ہے۔ آپ بتاریخ ۱۲ر دسمبر ۱۹۷۶ء ہماری دعوت پر سینار ہال میں تشریف فرما ہوئے۔ کارکنانِ لے سجے اردو سینار اور دیگر اراکین نے آپ کا خیر مقدم کیا۔ آپ نے انہیں خطاب فرماتے ہوئے ان سب اردو کتابوں کا ذکر کیا جن کا روسی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس خوشگوار صحبت کے بعد محترم پروفیسر نے ایک کتاب سینار لائبریری کو بطور ہدیہ پیش کی جو انتہائی شکریہ کے ساتھ قبول کی گئی بعد میں صاحب موصوف نے وزیٹرس بک میں حسب ذیل جملے درج فرمائے۔

مجھے بڑی خوشی ہے کہ میں اس کتب خانہ میں کتابیں دیکھنے کے لئے آیا۔ مجھے یقین ہے کہ اردو زبان سیکھنے کے بعد ہم ہندوستانی ادب سے اچھی طرح واقف ہو سکتے ہیں۔

(دستخط) گوروف

پروفیسر صاحب کے ساتھ ماسکو کے ایک طالب علم یفنا امیا بھی تشریف فرما ہوئے تھے۔ یہ ہندی سے واقف ہیں۔ انہوں نے وزیٹرس بک میں ناگری رسم الخط میں ذیل کا جملہ درج کیا۔

مجھے یہ آشا ہے کہ دوسری ملاقات کے دوران میں میں اردو بھاشا میں کہہ سکوں گا۔

(دستخط) یفنا امیا۔ ودیارتی ماسکو وشواودیالہ

نواب چھتاری کی تشریف آوری

نواب صاحب موصوف دسمبر ۱۹۵۶ء میں مسلم کونشن کے اجلاس کے لئے مدراس تشریف فرما ہوئے تھے۔ آپ ڈاکٹر عبدالحق صاحب بہادر کے ساتھ ۲۲ر دسمبر کو سیمینار ہال دیکھنے کے لئے تشریف فرما ہوئے۔ سیمینار کی کارروائیوں سے آگاہ ہونے کے بعد حسب ذیل ارشاد گرامی "وزیٹرس بک" میں قلمبند فرمایا۔

مجھے اس ادارہ کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ اردو زبان کی مدراس میں بڑی خدمت ہورہی ہے۔ میں اس کے بانی جلال الدین صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں اور ان کا مرہون منت ہوں کہ وہ میری زبان کی خدمت مدراس میں کررہے ہیں۔

(دستخط) احمد سعید

(نواب چھتاری)

روئداد کو ختم کرتے ہوئے ہم اپنے مربی و سرپرست ڈاکٹر الحاج مولوی عبدالحق صاحب اور اس ادارے کے صدر محترم مولوی الحاج سید عبدالوہاب صاحب بخاری کا موّدبانہ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ ان کی نوازشات ہمارے اس ادارے کو برابر حاصل ہوتی رہیں گی۔ ہم ہز اکسیلنسی سری پرکاسا گورنر بمبئی اور ہمارے اعزازی سرپرست کا نہایت ہی مودبانہ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ان بزرگوں کے علاوہ ہم اپنے مشیر پروفیسر صفدر حسین صاحب اور پروفیسر حمید علی خاں صاحب کے بھی مرہون منت ہیں۔ جن کے بیش بہا مشوروں سے سیمینار کو بڑی تقویت پہنچتی رہی ہے۔ ہم اراکین اکسیلری کمیٹی اور دیگر اراکین کا بھی فرداً فرداً شکریہ ادا کرتے ہیں۔

آخر میں ہم اس روئداد کو دربار ایزدی میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہوئے اور اس کے پاک حبیب کے صدقے میں اپنی حاجت براری کی دعا کرتے ہوئے ختم کرتے ہیں۔

اردو زندہ باد

جے ہند

مولوی الحاج یم، عبدالحق صاحب یم۔اے، ڈی۔اِل۔ اِکن)
ممبر پبلک سروس کمیشن مدراس

حاجی جمال محمد مرحوم

حاجی جمال محمد صاحب مرحوم کی زندگی کے واقعات اور سوانح حیات کو تفصیلی طور پر قلمبند کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس واسطے کہ صاحب موصوف کی زندگی کے مختلف پہلو تھے۔ ایک ہی وقت میں وہ چوٹی کے مخیر رئیس بھی تھے اور ایک سمجھدار سیاست دان بھی، علمی اور قومی اداروں کے سرپرست بھی تھے اور قوم کے نونہالوں کی تعلیم وتربیت کے مددگار بھی، تجارت میں بھی ماہر تھے اور معاشیات اور پبلک فینانس میں بھی ایک بلند مرتبہ رکھتے تھے حقیقت میں یہ ایک علمی ادارے کا کام ہے کہ انکی تفصیلی سوانح حیات مرتب کرائے تاکہ ان کی زندگی کے مختلف پہلو اجاگر ہو جائیں

حاجی جمال محمد صاحب کے والد حاجی جمال محی الدین صاحب مرحوم صوبۂ مدراس کے سب سے جنوبی حصہ رام ناد کے باشندے تھے ان کے گھرانے کی مادری زبان ٹامل تھی۔ حاجی جمال محی الدین صاحب خاندانی تاجر تھے۔ چمڑے کی تجارت کے سلسلے میں مدراس آئے اور یہیں مقیم ہوگئے۔ اللہ نے ان کی تجارت میں بڑی برکت دی۔

حاجی جمال محی الدین صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں کئی وقف کئے ہیں جن میں مدراس کا عربی مدرسہ جمالیہ ایک مشہور وقف ہے۔ ترچناپلی میں بھی مسلمانوں کی تعلیم کے لئے انھوں نے وقف کردہ عمارتیں چھوڑیں دینی تعلیم کی اشاعت اور عربی زبان کی تعلیم کا انھیں خاص ذوق تھا۔ ان کے فرزند حاجی جمال محمد صاحب غالباً ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے ٹامل اور انگریزی کی تعلیم کرسچین کالج ہائی اسکول مدراس میں ہوی۔ نفتہ فارم کے بعد یہ اپنی تجارت میں معروف ہوگئے۔ خداداد ذہنی قابلیت کی وجہ سے اس میں بڑا درجہ حاصل کیا اور نہایت کامیاب تاجر سمجھے جانے لگے۔ یورپ کی پہلی جنگ عظیم سے قبل تجارت کے سلسلے میں انہیں یورپ کے سفر کا اتفاق ہوا اور اس زمانے کی بڑی اہم شخصیتوں سے ان کی ملاقاتیں رہیں۔ انگلستان کے بعض وزراء اور سیاستدانوں سے ملنے کا موقع ہوا۔ جرمنی میں بعض مشاہیر اور ترکی میں "انجمن اتحاد وترقی" کے ارباب حل وعقد اور مصر میں حریت پسند لیڈروں اور عالموں سے ان کی ملاقات رہی۔ شیخ جوہری طنطاوی سے مدارس عربیہ کے نصاب میں تبدیلی کے سلسلے میں دو ایک ملاقاتیں ہوئیں اور خود شیخ طنطاوی مرحوم نے اپنی کتاب "تفسیر الجواہر" جلد اول میں دو جگہ ان کا ذکر کیا ہے۔

یورپ اور ممالک اسلامیہ کا یہ سفر یورپ کی پہلی جنگ عظیم سے پہلے ان کے لئے بہت مفید ثابت ہوا جس کے بعد ان کی تجارت کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہوی۔

جنگ کے بعد مدراس کے مشہور لیڈروں کے ساتھ خلافت کی تحریک میں حصہ لیا۔ نقطۂ نظر سیاست میں ہمیشہ قومی رہا لیکن ہر قسم کے ادارے ان کی سخاوت سے فیض اٹھاتے تھے۔ سرنا نشکے لیے مسیح الملک حکیم اجمل خان صاحب مرحوم نے دہلی میں ان سے چندہ طلب کیا تھا تو انہوں نے بڑے مودبانہ انداز میں چیک بک پیش کردی اور حکیم صاحب کو اجازت دی کہ اپنی جانب سے جو رقم چاہیں بھر لیں۔ لیکن حکیم صاحب نے انہیں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی جانب سے لکھ دیں۔ حکیم صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ انہیں سخت حیرت ہوئی جب کہ انہوں نے یہ دیکھا کہ جمال محمد صاحب مرحوم نے ایک لاکھ روپیہ کا چیک لکھ کر حوالہ کر دیا۔ قوم کے دیگر ملی اداروں میں ان کی خیرات کا یہی عالم تھا۔ جنوبی ہند کے مدارس عربیہ "اسلامی انجمنیں" بلکہ غیر مسلموں کے تعلیمی اور سوشل ادارے بھی ان کے دسترخوان سے زلّہ ربا تھے۔

سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد راقم الحروف کا بھی مدراس میں پہلے طالب العلم کی حیثیت سے اور اس کے بعد پروفیسر کی حیثیت سے قیام رہا۔

میری ملاقاتیں ۱۹۲۲ء سے شروع ہوئیں جبکہ میں نے گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے چارج لیا تھا۔ دو ایک ملاقاتوں کے بعد حاجی جمال محمد صاحب مرحوم نے دینی مسئلہ پیش کیا جس کی انہیں دھن تھی یعنی عربی مدرسہ کے لئے ایک ایسا نصاب بنایا جائے جس میں علوم جدیدہ اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی شامل ہو اور معیار عربی تعلیم کا کسی حیثیت سے کم نہ ہو۔ اس سلسلے میں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جمال محمد صاحب کے یہاں متعدد مجلسیں ہوتی تھیں اور اکثر مجلسیں اتوار کے دن صبح سے شام تک رہا کرتی تھیں جن میں نصاب کی ترتیب و ترمیم کا اہم کام ہوا کرتا تھا۔ اس مجلس میں گورنمنٹ محمڈن کالج کے اکثر پروفیسر اور علماء بھی شامل رہا کرتے تھے ایک مدت کی بحث و تمحیص کے بعد ایک نصاب تیار کیا گیا اور خود ان کے "مدرسہ جمالیہ" میں اس کو بطور تجربہ رائج کیا گیا سب سے بڑا مشکل مسئلہ اساتذہ کے مہیا کرنے کا تھا جمال محمد صاحب نے اس سلسلہ میں بڑی سیر چشمی کے ساتھ ہر جگہ سے قابل افراد کو انتخاب کیا اور انھیں اپنے مدرسہ میں استاد کی حیثیت سے رکھا۔ مدرسہ کی تعلیمی حالت روز افزوں ترقی پذیر تھی اور جمال محمد صاحب کی تجارت کو بھی اللہ پاک نے فروغ دیا تھا اپنے خلوص نیت اور ہمت سے انھوں نے قوم کے نونہالوں کی تعلیم میں جو مدد کی اس کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ ایک جلسہ میں میں نے کبھی یہ ذکر کیا تھا عربی مدارس میں جدید نصاب کے رواج کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ انگریزی پڑھنے والے مختلف طلبہ کو ایک ایسے ہاسٹل میں رکھا جائے جہاں دینی تعلیم اور قرآن وحدیث کے درس کا انتظام ہو اور ایک دینی ماحول ہو اور تعلیم کے لئے نہایت رعایت کے ساتھ بلکہ مفت رہنے سہنے کا انتظام کر دیا جائے تو وہاں کے طالب علم اچھا اثر لے کر نکلیں گے۔ وقت کی بات ہے کہ جمال محمد صاحب کے دل میں یہ بات اثر کر گئی اور انھوں نے ایک ہفتہ کے اندر ہی اندر [illegible] کے سامنے ایک بہت بڑا وسیع اور عظیم الشان بنگلہ تقریباً تین سو روپیہ ماہانہ کرایہ پر تین سال کے لئے لیا اور اس

میں ایسا ہاسٹل کھولنے کا انتظام کیا کہ جس میں مختلف کالجوں کے طلبہ کو داخل کیا گیا۔ اس بورڈنگ ہاؤز کا نتیجہ تھا کہ مسلمان نوجوان جو تعلیم سے محروم رہا کرتے تھے۔ ایک کثیر تعداد میں کالجوں میں داخل ہونے لگے اور یہاں تقریباً سو ڈیڑھ سو طلبہ کے رہنے کا انتظام کیا گیا۔ ان کے لئے صرف لکھنے پڑھنے اور رہنے کا انتظام ہی نہیں تھا بلکہ کالجوں کو آنے جانے کے لئے موٹر بسوں کے اخراجات کی حیثیت سے پانچ دس روپیہ ماہوار وظیفہ بھی دیا جاتا تھا۔ غالباً اس ہاسٹل کے پہلے وارڈن اور ڈپٹی وارڈن مولانا ابوظفر ندوی اور مولانا ابوالجلال ندوی تھے۔ تین چار سال تک یہ ہاسٹل نہایت کامیابی سے چلتا رہا اور اس مدرسے سے صدہا نوجوان اپنی تعلیم ختم کرکے زندگی کے مختلف شعبوں میں چلے گئے۔

آج بھی جنوبی ہند کے بعض مشہور افسر، وکلاء، ڈاکٹر پرنسپل اور سیاستداں اسی ہاسٹل کے بورڈروں میں سے ہیں۔ ایک بات ان سب میں مشترک پائی جاتی ہے وہ ان کی مذہبیت اور ان کی ملی حمیت ہے۔ بانی کے خلوص نیت کا اثر تھا کہ ان کی اسکیم بڑی کامیاب رہی۔ شاید یہ اور بہت دنوں چلتا لیکن تجارت کے پیٹا کھانے اور اقتصادی حالت کے عام طور پر بگڑ جانے کی وجہ سے ہم نے بمجبوری اس اسکیم کو ختم کرنا پڑا۔

[illegible] رمضان میں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ موصوف [illegible] تک میرے ساتھ بیٹھے رہے [illegible] فرما رہے تھے۔ اس سلسلہ میں "ہیبٹ لکچرز" کا [illegible] آیا اور انہوں نے کہا کہ [illegible] شخص [illegible] اس قسم کے علمی اور دینی لکچرز کا انتظام کیا ہے

ہم کو بھی چاہئے کہ اپنے نوجوانوں کے لئے اسی قسم کا ایک سلسلہ چھوٹے پیمانے پر رائج کریں۔ میں نے کہا "یہ کر تو سکتے ہیں لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ اس کے اخراجات کافی ہوں گے"

جمال محمد صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں سالانہ پانچ چھ لکچرس کے لئے کسی ایک کا انتخاب کیا جائے تو کیا اخراجات ہوا کریں گے۔ میں نے کہا کم از کم دو ہزار اور زیادہ سے زیادہ تین چار ہزار کے قریب بجٹ ہوگا اور آپ اس اسکیم کے ماتحت ہندوستان کے بہترین اصحاب کو اس سلسلے میں مدعو کر سکتے ہیں جمال محمد صاحب نے فی الفور اس کو منظور کر لیا اور تن تنہا سارے مصارف اپنی جیب سے دینے کا وعدہ کیا۔ اور صدر انجمن تعلیمی مسلمانان جنوبی ہند کی سرپرستی میں ایک کمیٹی بنائی اور انتظام حمید حسن سیٹھ صاحب مرحوم کے سپرد ہوا اور پہلے لکچرر کا انتخاب مجھ ہی پر موقوف رکھا گیا اور میں نے علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کا نام پیش کیا۔ کہ ان سے درخواست کی جائے کہ سیرتؐ نبوی کے بعض اہم پہلوؤں پر ان کی تقریریں ہوں۔ خط و کتابت کے بعد علامہ مرحوم نے ہماری درخواست قبول کر لی اور وہ مدراس رونق افروز ہوئے اور یہاں وہ مشہور خطبے دئے جو بعد میں "خطبات مدراس" کے نام سے دارالمصنفین سے شائع ہوئے۔ کتاب کی اہمیت اور ان خطبات کی افادیت پر کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے اور یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ ان خطبات نے بہت سے نوجوانوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ جمال محمد صاحب مرحوم کی سرپرستی کا [illegible]

ہو رہا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا وہ بہت کم ہے اور یہ کامیابی اور یہ شاندار نتیجہ حقیقت میں فضل الٰہی ہے"۔ دوسرے سال نظر انتخاب محمد مارماڈیوک پکتھال پر پڑی اور یہ ہماری دعوت پر مدراس تشریف لائے اور یہاں اسلام کے ثقافتی پہلو پر چھ لکچر دیئے۔ یہ کتاب بھی انگریزی میں شائع ہو گئی اور اب تک اس کے دو تین اڈیشن نکل چکے ہیں۔ تیسرے سال سر محمد اقبال کو دعوت دی گئی کہ وہ مدراس تشریف لائیں اور کسی خاص اسلامی موضوع پر مکمل طور پر لکچرر کو ایک سال کا وقفہ دیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے لکچرز تیار کر سکے اور انہیں سنانے کے بعد ان کو کتابی حیثیت میں شائع کیا جا سکے۔ سر محمد اقبال مرحوم کے وہ معرکۃ الآرا خطبات جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں سب سے پہلے مدراس میں اسی کمیٹی کی سرپرستی میں مختلف نشستوں میں سنائے گئے۔ اس کے متعدد اڈیشن آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان خطبات کا اردو زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ جمال محمد صاحب مرحوم کے اور کوئی کارنامے نہ بھی ہوتے تو صرف یہ کارنامہ ان کی بقائے دوام کے لئے کافی تھا۔

سر محمد اقبال مرحوم جب مدراس تشریف فرما ہوئے تو ان پر جمال محمد صاحب کی شخصیت کا گہرا اثر ہوا۔ اور اس کے متعلق انہوں نے مدراس میں وائی۔ ایم۔ اے۔ ہال میں تقریر فرماتے ہوئے صاحب موصوف کے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔

"حاجی جمال محمد صاحب کی شخصیت نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ ایک شخص سادہ لباس میں ہے۔ کروڑوں کی تجارت کرتا ہے اور دقیق فلسفیانہ مسائل پر گفتگو کر سکتا ہے۔ اسلام نے اسی PLAIN LIVING AND HIGH THINKING کی تعلیم دی تھی۔ شکل دیکھو تو درویشوں کی اور دل دیکھو تو بادشاہوں کا۔ اسی زندگی کی سرور کائنات ؐ نے ہدایت کی تھی جس وقت سے مسلمانوں نے یہ زندگی چھوڑی اسی دن سے زوال شروع ہو گیا۔ ہم سب کو چاہئے کہ اس معاملہ میں حاجی صاحب کی تقلید کریں۔

رسالہ سفینہ بابتہ جنوری ۱۹۳۹ء

جمال محمد صاحب کی سادہ زندگی کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ وہ رسم و رواج کی بندھنوں سے آزاد تھے شادی بیاہ کے معاملہ میں جس سادہ طریقہ کو انہوں نے اپنے خاندان کے لئے اختیار فرمایا تھا، اس کی مثال مشکل ہی سے ملتی ہے۔ ان کے لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کی اطلاع خاص خاص احباب تک کو بھی نہ ہوتی تھی۔ طریقۂ کار یہ تھا کہ جب کبھی اپنی کسی لڑکی کے بیاہ کا خیال دل میں آیا اور انہوں نے اپنے ہونے والے داماد کا اپنے ذہن میں انتخاب کر لیا اور ایسے اشخاص عموماً ان کے افراد خاندان سے یا مدرسۂ جمالیہ کے طلبہ میں سے کوئی نہ کوئی ایک ہوا کرتا تھا۔ اس قسم کے فیصلہ کے بعد ہی چند گھنٹوں یا دو ایک دن کے اندر اندر نہایت سادہ طریقہ پر گھر کے افراد کی موجودگی میں مدرسۂ جمالیہ کا کوئی استاد صیغۂ نکاح پڑھ لیتا تھا۔ اور اس کے بعد طلبہ اور اساتذہ کو کھانا کھلا دیا جاتا تھا۔ گھر میں جو کچھ لباس اور زیور مہیا ہوتا تھا وہ لڑکی کو دے دیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ رخصتی ہو جاتی تھی۔ اپنے نہایت وسیع کپڑے کے [illegible]

چھوٹے چھوٹے بنگلے ہوتے تھے۔ ان میں سے کسی ایک میں ان کے قیام کا بندوبست ہوتا تھا اور حسب استطاعت ان کو کسی کام میں لگا دیا جاتا تھا۔ آج بھی جمال محمد صاحب کی اولاد اسی طریقہ پر عمل پیرا ہے اور سنت رسول کی اس سادگی کی بنیاد جو اس گھرانے میں ڈالی گئی ہے اس کا ثواب یقیناً بانی کی روح کو پہنچتا ہوگا۔ لباس اور طرز معاشرت میں بھی سادگی نمایاں تھی۔ عام طور پر لنگی۔ سفید کرتا اور ایک پگڑی روزانہ کا لباس تھا۔ ولایت کے سفر میں یا اور رسمی محفل میں سیاہ شیروانی اور ماسی رنگ کی پتلون پہنا کرتے تھے۔ لباس کی طرز میں بھی ان کی اولاد و احفاد کی تقلید حیرت انگیز ہے۔ اس سادہ معاشرت نے ان کی زندگی میں وقار پیدا کیا تھا صاحب نظر لوگوں کی نگاہ سب سے پہلے اسی پر پڑتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ سر محمد اقبال نے اپنے تاثرات کا اظہار اپنی تقریر میں فرمایا۔

جمال محمد صاحب مرحوم کا ایک اور کارنامہ جس کو آسانی سے نہیں بھلایا جا سکتا وہ ان کی بروقت امداد ہے جو انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کو عطا کی۔ غالباً ۱۹۲۷ء دسمبر میں جب کہ مختلف اسباب کی وجہ سے جامعہ کی مالی حالت بالکل نازک صورت اختیار کر چکی تھی۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کا یہ ارادہ ہوا کہ وہ مدراس پہنچ کر جامعہ کی امداد کی تحریک کریں اس زمانے میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا اجلاس بھی مدراس میں مقرر تھا اور اس کے صدر ڈاکٹر انصاری مرحوم تھے اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بھی زیر صدارت سر عبدالقادر مرحوم یہیں ہو رہا تھا۔ دسمبر کے آخری ہفتہ میں ان اجتماعات کے موقعوں پر مسیح الملک مرحوم نے ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کو جو اس زمانے میں جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے کارفرما تھے، مدراس روانہ فرمایا اور ان سے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ کانگریس کے اجلاس کے زمانے تک وہ خود بھی مدراس پہنچ جائیں گے گو یہ انتظام اپنے خیال میں مسیح الملک نے فرمایا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ عین اس زمانے میں حکیم صاحب مرحوم رامپور سے دلی آتے ہوئے ٹرین میں عارضہ قلب سے وفات پا گئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب (جو آج کل بہار کے گورنر ہیں) مدراس پہنچ چکے تھے اور انہیں روزانہ مسیح الملک کی آمد کا انتظار تھا کہ یکایک اس حادثہ جانفرسا کی اطلاع اخبارات کے ذریعے ملی۔ لازمی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب پر اس کا بڑا اثر ہوا اور مایوسی کا غلبہ رہا۔ اس زمانے میں سب سے پہلی دفعہ راقم الحروف کی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے ملاقات ہوئی اور اس سلسلے میں میں نے اور بعض جامعہ سے ہمدردی رکھنے والے اصحاب نے یہ تجویز کی کہ جمال محمد صاحب مرحوم سے اس سلسلے میں استمزاج کیا جائے اور مسیح الملک مرحوم کی آرزو سے انہیں آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے جس وقت جامعہ کے سارے پوست کندہ حالات بیان کئے اور مسیح الملک مرحوم کے ارادے کی اطلاع دی۔ جمال محمد صاحب نے نہایت ہی خندہ پیشانی سے تا بحد امکان امداد کا وعدہ فرمایا اور دو ایک روز کے بعد انہوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کو

جلسے کی دعوت کلبس میں مدراس کے اکثر معزز تاجر شریک تھے۔ اور وہیں جامعہ کی امداد کی تحریک کی اور خود اپنے اور اپنے خاندان کے افراد کی جانب سے عطیات کا اعلان فرمایا جن کی مجموعی رقم شاید سترہ (۱۷) ہزار سے زیادہ تھی۔ اس کے بعد مدراس کے دیگر تاجروں سے رقمیں دلائیں۔ دو چار روز میں تقریباً چالیس (۴۰) ہزار روپے کی گرانقدر رقم مہیا کر دی گئی۔ جامعہ ملیہ کی تاریخ میں یہ وہ نازک دور تھا۔ جس میں کارکن ابتلا اور آزمائش سے تقریباً مایوسی کے درجے پر پہنچ گئے تھے۔ اس امداد نے ایک نئی روح پھونک دی اور جامعہ کا نیا دورِ زندگی شروع ہوا۔ جمال محمد صاحب مرحوم کی قومی خدمات میں سے یہ ایک ایسی خدمت ہے جس کو انہوں نے نہایت ہی خاموشی سے کیا اور اس کی نہ تو اشاعت کی اور نہ اس کو ذریعۂ شہرت سمجھا۔

تجارتی معاملات اور معاشی مسائل میں ان کی نگاہ دوربین اور دوررس تھی۔ جنگ عظیم کے بعد عالمی کساد بازاری سے حکومت برطانیہ نے معیار زر اسٹرلنگ کے لئے باقی نہ رکھا تھا اور اس وجہ سے پونڈ کی شرح تبادلہ پر بڑا کافی اثر پڑا تھا۔ حکومت ہند نے ہندستان کے روپے کو پونڈ کے ساتھ منسلک کر دیا تھا اس سے تجارتی منڈیوں میں روپے کی قیمت گھٹ گئی تھی اور اس کا شرح تبادلہ پر بڑا برا اثر پڑا تھا۔ حکومت اور حکومت کے ہم نوا اکانومسٹ نے اس طرز عمل کی خوبی کو مدلل طور پر ثابت کرنا چاہا اور ہندستان کے فائنس ممبر نے اس کی تائید میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ جمال محمد صاحب نے اس زمانے میں متعدد آرٹیکل اس مسئلہ پر لکھے اور ہندوستان کے مشہور انگریزی اخبارات اور معاشی رسالوں میں شائع کئے ان میں انہوں نے گورنمنٹ کے اس فیصلہ کو ہندوستان کے حق میں نہایت مضر ثابت کیا۔ واقعہ بھی تھا کہ اس سے اگرچہ ان تاجروں کو جو باہر سے مال منگوایا کرتے تھے۔ عارضی طور پر فائدہ ہوا لیکن ہندستان سے بیرونی ممالک کو اشیاء بھیجنے والے تاجروں کو- اور خصوصاً تاجران چرم کو جو نقصان پہنچا ہے اس نے ۱۰۔ ۲۰ سال تک ان تاجروں کو معاشی بحران میں مبتلا کیا اس زمانے میں جمال محمد صاحب کے مدلل اور محققانہ مضامین کی شہرت سے کامرس کی جگہ پر اسمبلی میں ان کا انتخاب ہوا اور اس زمانے کی لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک مدت تک ممبر رہے اور اسی زمانے میں ہندوستان بھر کے تاجروں کے چیمبرس کے فیڈریشن نے انہیں اپنا صدر منتخب کیا اور یہ یقیناً ایک ایسا اعزاز تھا جو شاید ہی مسلمانوں میں کسی کو میسر ہوا ہو مدراس یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد جمال محمد صاحب کی تحریروں کے اس قدر قائل تھے کہ انہوں نے یونیورسٹی کی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ ایک غیر گریجویٹ کو اکنامکس اور کامرس کے بورڈ آف اسٹڈیز کا ممبر منتخب کیا۔

جمال محمد صاحب کی توجہات ابتدا سے ملک کے سیاسی مسائل کی طرف بھی رہا کیں اور اس کا میں نے اشارۃً تذکرہ کیا ہے کہ ان کی ہمدردی ہمیشہ سے سیاست میں کانگریس کے ساتھ تھی گو مدراس میں یہ مسلم لیگ کے صدر بھی رہے اور مسلم لیگ کا دفتر انہی کے آفس

میں رہا لیکن ان معاملات میں ان کی رائے بڑی صائب تھی۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں جمال محمد صاحب مرحوم کو بھی انڈیا گورنمنٹ نے منتخب کیا۔ یہ پہلے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک رہے۔ ہندو اخبار کے صفحات شاہد ہیں کہ اس زمانے میں انہوں نے گاندھی جی اور محمد علی جناح سے مصالحت کی بہت کچھ کوشش کی لیکن ان ساری مساعی کا نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا اور ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ بہت دنوں کے لئے ملتوی ہو گیا۔ انگلستان کے اس دورے کی واپسی کے بعد جمال محمد صاحب مرحوم کی زیادہ تر توجہات تعلیم اور عربی مدارس کی اصلاح پر مبذول ہو گئیں۔ تجارت کی حالت روز بروز گرتی جاتی تھی لیکن ان کی داد و دہش اور قومی کاموں میں امداد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں راقم الحروف نے آکسفورڈ جانے کا خیال کیا تو جمال محمد صاحب نے بہت کچھ ترغیب دلائی اور ہر طرح کی امداد فرمائی۔ سیاحت کا شوق دلایا۔ یورپ کے مختلف ممالک کی سیر اور بالخصوص جمہوریہ ترکیہ میں کچھ دن اقامت کے لئے انہوں نے مجھ کو مجبور کیا بلکہ وہ میرے انگلستان کے قیام کے زمانے میں برابر خط لکھا کرتے تھے۔ اور یورپ کے مختلف ممالک کی سیر کا شوق دلایا کرتے تھے سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد عموماً تاجرانِ چرم کی حالت اور جمال محمد صاحب کی تجارت میں خصوصاً ایک زبردست انقلاب پیدا ہو گیا تھا لیکن جمال محمد صاحب کی تجارتی دیانت کی ایک عجیب و غریب مثال یہ ہے کہ انہوں نے جس وقت اپنی تجارت بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تو اپنے سارے قرضداروں سے جن پر ان کی رقم نکلتی تھی اور جن سے اس قرض کے حاصل کرنے کی مستقبل قریب میں کوئی امید نہ تھی بلا کر بخوشی ان کے دستاویزات قرض واپس کر دئے اور جن کمپنیوں کو انہیں رقم دینا تھی ان کی پائی پائی کا حساب کر کے بھجوا دیا۔ یہی نہیں بلکہ مدارس اور انجمنوں کی جو کچھ تنخواہیں وظیفے اور امداد مقرر تھی ان کو بھی اس مہینے میں منی آرڈر کے ذریعے سے رقمیں بھیجدی گئیں اور اس کے ساتھ یہ معذرت کی گئی کہ آئندہ شاید میں آپ کی مدد نہ کر سکوں۔

مجھے بھی بعض اداروں کی سرپرستی کی بدولت ان واقعات سے آگاہی رہی اور میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اس قسم کی مثال ملنی بہت ہی مشکل ہے۔ غالباً جمال محمد صاحب کے کردار کی ان خوبیوں نے ہندوستان کی ایک عظیم الشان ہستی سر محمد اقبال کو اس طرح متاثر کیا تھا کہ انہوں نے علی الاعلان ان کی تعریف کی تھی۔

مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں ان کی زندگی کے مختلف پہلو تشنہ رہ گئے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ ان کی سوانح اور معاملات کو جمع کرنا ایک ریسرچ اسکالر کا کام ہے جو اس زمانے کے اخبارات اور رسائل کے مضامین کی چھان بین کرے اور ان پر تفصیلی تبصرہ کر سکے۔ مرحوم کی زندگی نوجوانوں کے لئے ایک مشعل راہ ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ اعلیٰ کردار، محنت اور دیانت سے ایک شخص اپنے آپ کو کس بلند درجے تک پہنچا سکتا ہے۔

الحاج مولوی سید عبدالوہاب صاحب بخاری
یم۔ اے۔ ایل۔ ٹی

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ (القرآن)

(یقیناً ان لوگوں کی کہانیوں میں سمجھ والوں کیلئے نصیحت ہے)

آپ کا نام نامی محمد بن محمد بن محمد بن احمد اور کنیت ابوحامد ہے۔ یعنی آپ ابو حامد محمد بن محمد بن محمد بن محمد الغزالی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کے نام کے متعلق ایک دلچسپ حکایت نقل کی جاتی ہے۔ یہ حکایت نقل و روایت کی رو سے جس قدر بھی ضعیف ہو پھر بھی نتیجہ سے خالی نہیں اور اس سے آپ کی حاضر جوابی اور قوت مناظرہ کا پتہ چلتا ہے جس کی وجہ سے آپ اپنے معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے تھے۔ وہ حکایت اس طرح ہے کہ ایک مرتبہ آپ کی ملاقات عالم رؤیا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی۔ جب اس جلیل القدر نبی نے آپ کا نام دریافت کیا تو آپ نے عرب کے دستور کے مطابق اپنا نام مع کنیت و نسب سب کچھ سنا ڈالا اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قدرے تعجب کا اظہار فرمایا اس لئے کہ انہوں نے تو صرف آپ ہی کا نام دریافت فرمایا تھا۔ آپ نے جواباً یہ کہا کہ یہ طریقہ تو خود حضرت مشارٌ الیہ کی سنت ہے اور اس مکالمہ کو یاد دلایا جو ان میں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان منقول ہے۔ یعنی یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا کا معجزہ عطا فرمایا تھا تو آپ سے یہ سوال ہوا تھا کہ "اے موسیٰ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ (وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ) اس سوال کے جواب میں حضرت موسیٰ نے یہ عرض کی تھی کہ یہ میرا عصا ہے۔ اس پر ٹیکہ لیا کرتا ہوں اور اس سے اپنے بھیڑ بکریوں کے لئے جھاڑ و سے پتے توڑ لیا کرتا ہوں اور یوں بھی اس سے میرے بہتیرے کام نکلتے ہیں۔ آپ سے صرف عصا کے متعلق سوال کیا گیا تھا لیکن جواب تفصیل سے گذرانا گیا تھا۔ پس اگر امام موصوف نے اپنے نام کے ساتھ اپنی کنیت اور اپنے باپ دادا کے نام بھی گنوا لئے تھے تو یہ عین سنت موسوی تھی جس کا ذکر کیا گیا۔

شیخ کمال الدین دمیری اپنی کتاب حیوٰۃ الحیوان کی جلد اول میں نقل فرماتے ہیں کہ شیخ عارف باللہ ابوالحسن شاذلی نے ان سے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام سے فرماتے تھے کہ آیا تم نے اپنی امت میں (امام غزالی کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے) ایسا متبحر کوئی شخص دیکھا ہے۔ ان دونوں بزرگوں نے جواباً فرمایا کہ نہیں۔

لیکن حضرت شیخ رحمۃ اللہ کی فضیلت خواب و خیال

ں دنیا سے ہٹ کر بہت ہی استوار بنیادوں پر بھی قائم ہے۔ آپ تمام علوم متداولہ معقول و منقول میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ آپ کے زمانے تک فلاسفۂ یونان ارسطو و افلاطون وغیرہم کے تراجم عربی میں ہو چکے تھے اور اب دین کو فلسفہ اور منطق کے اوزان میں تولا جانے لگا تھا۔ دنیائے اسلام کے سامنے یہ ایک نہایت ہی اہم مسئلہ تھا جس سے صحیح اور موثر حل پر ہی دین کے استحکام کا دارومدار تھا۔ امام غزالی نے ان نئے تقاضوں کا جائزہ لیا۔ اور علم الکلام کی بنیاد رکھی جس کے ذریعے دین کے احکام کو عقل، منطق اور فلسفہ کی کسوٹی پر جانچا جانے لگا۔ اور آپ نے اس میدان میں وہ جوہر دکھائے جن کی بنیادیں ان نئے حالات میں بھی مضبوط ہو گئیں۔

آپ نے فلاسفۂ یونان کی ذہنی لغزشوں کو ایک ایک کر کے واضح کیا اور دین اسلام پر جو منطقی اعتراضات وارد ہو سکتے تھے ان کا مدلل اور مسکت جواب دیا اور یہی یہی وجہ ہے کہ دنیائے اسلام نے بالاتفاق آپ کو حجۃ الاسلام یعنی اسلام کی دلیل مان لیا۔ اور آپ کے مذاہب اربعہ کے قابل احترام بانیوں کے ہم پلہ مانا جاتا ہے اور بعض وقت [illegible]

آپ خراسان کے مشہور شہر طوس میں سنہ ۴۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے والد روئی کو صاف کیا کرتے اور اس کی تجارت بھی کیا کرتے تھے۔ غزال روئی کے صاف کرنے والے کو کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ اسی بنا پر آپ غزالی کہلائے۔ نفس الامر بھی ایسا ہونا ممکن ہے۔ اس لئے کہ اسلام نے نئی قدریں قائم کر دی تھیں اور انسان کی قیمت اس کے پیشہ اور [illegible] سے ہٹ کر اس کی ذاتی صلاحیت سے متعین ہو چکی تھیں۔ "تم میں زیادہ معزز وہی ہے جو زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے" کا حکم ناطق نافذ ہو چکا تھا اور یوں بھی اسلام میں سارے پیشے برابر تھے۔ معیار برتری صرف ذاتی صلاحیت اور افادیت قرار پایا تھا۔ اس طرح مشاہیر اسلام میں اگر کوئی غزالی تھے تو کوئی عطار (یعنی دوا فروش) کوئی صفار (یعنی پیتل کے برتن بنانے والے) اور کوئی خیام (ڈیروں کو درست کرنے والے) کسی پیشہ کو حقیر نہیں گنا جاتا تھا۔

بعض لوگ اس طرف بھی گئے ہیں کہ غزال اعلاۓ طوس میں ایک مردم خیز قصبہ ہے جہاں پر حجۃ الاسلام مشارٌ الیہ نے اپنی پہلی سانس لی تھی۔ بعض لوگ آپ کو غزالہ بنت کعب الاحبار کی طرف بھی منسوب کرتے ہیں جو ایک مشہور یہودی عالم تھے جو بعد میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ لیکن ان تمام اقوال میں زیادہ راجح اور مقبول قول یہی ہے کہ آپ اپنے یا اپنے والد کے پیشہ کی بنا پر غزالی کہلائے۔

بچپن میں آپ نے جیسا کہ اس زمانے کا تعلیمی نظام تھا۔ فقہ کی تعلیم احمد بن محمد رازکانی سے حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے جرجان کی راہ لی اور وہاں امام نصر کے شاگردوں میں شامل ہوئے اس زمانے کا ایک واقعہ آپ کی زندگی میں بہت مشہور ہے اور وہ یہ کہ جب آپ جرجان سے وطن لوٹ رہے تھے تو راستے میں آپ کے قافلہ کو بعض قطاع طریق نے آن لیا ان ڈاکوؤں نے قافلے کے مال و متاع کے ساتھ غزالی کی بھی یادداشتوں کو [illegible] ان کی زندگی کا واحد سرمایہ تھیں، [illegible] ان تعلیقات کو غزالی نے بڑی کوشش سے ایک جگہ جمع کر لیا

تھا غزالی نے چوروں کے سردار سے ملاقات کی اور اس سے اپنے کاغذات مانگے اور یہ بھی کہا کہ یہ چیزیں سردار کے کسی کام کی نہیں اس پر اس سردار نے کہا۔ تو پھر یہ تمہارے کس کام کی ہیں۔ غزالی نے جواب دیا کہ یہی میری زندگی کا سرمایہ ہے اور اسی کے لئے میں نے مدتوں پہلے ترک وطن کیا تھا۔ چوروں کا سردار ہنس پڑا اور کہا کہ تم پر بڑا ہی افسوس ہے کہ اگر یہ چیزیں گم ہو گئیں تو تم جاہل کے جاہل رہ جاؤ گے۔ پس تم عالم ہونے کا دعویٰ کس بنا پر کر سکتے ہو۔ یہ کہہ کر اس سردار نے غزالی کے متاع علمی کو واپس کر دیا۔ چوروں کے سردار نے جو کچھ کہا تھا اس کا گہرا اثر غزالی پر پڑا غزالی نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک چور کو یہ دلیل اور منطق اس لئے سکھائی کہ میں اس سے فائدہ اٹھا سکوں۔ چنانچہ وہ وطن پہنچ کر تین سال تک ان تمام یادداشتوں کو زبانی یاد کر لینے میں لگے رہے تاکہ اگر یہ چیزیں مفقود بھی ہو جائیں تو وہ ان کے سینے میں محفوظ رہیں۔ اس واقعہ سے غزالی کے قلب سلیم کا پتہ چلتا ہے۔ سچ ہے کہ لا تنظروا الیٰ من قال ولکن انظروا الیٰ ما قیل : یعنی یہ نہ دیکھو کہ بات کس نے کہی ہے بلکہ یہ دیکھو کہ کیا کہا گیا ہے۔ غزالی کی نیک اور اتنا وسیع نے ان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے۔ وہ مثل سچ ہے کہ اگنے بروا کے چکنے چکنے پات! اس واقعہ کو نظام الملک وزیر آل سلجوق نے بھی ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد غزالی نیشاپور پہنچے اور امام الحرمین ابو المعالی علامہ جوینی کی درسگاہ میں شریک ہو گئے۔ اور نہایت مستعدی اور سرگرمی سے مذہب، منطق، فلسفہ حکمت اور اخلاق کی تعلیمات میں کمال حاصل کیا۔ فلاسفہ کے جو اعتراضات مذاہب پر وارد ہوتے تھے ان کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ اور ان کے رد میں مدلل کتابیں لکھنی شروع کیں چنانچہ اس دور کی یادگار ان کی مشہور آفاق تصنیف تہافۃ الفلاسفہ ہے۔ . . . .
. . . تہافہ کے معنی ٹھوکر کھانے اور لغزش کے ہیں۔ کتاب کا مضمون اس سے واضح ہے۔ امام غزالی نہایت ذکی الحس، بعید الفکر، باریک بین اور دقیقہ رس عالم تھے علم مناظرہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ خود ان کے استاد امام الحرمین ان کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ غزالی علم کا دریا ہے۔ دشمنوں کے لئے پھاڑنے والا شیر اور ان کے اوراق کو پریشان کرنے والی تند آندھی ہے

امام الحرمین کے انتقال کے بعد غزالی نے عسکر کا رخ کیا۔ یہ شہر بغداد سے کم و بیش پینسٹھ میل شمال کی جانب واقع ہے۔ اس کو بنو عباس کے آٹھویں خلیفہ المعتصم باللہ نے اپنے ترکی خانہ زادوں کے لئے آباد کیا تھا۔ یہ شہر نصف صدی سے کچھ زیادہ عرصہ تک دنیائے اسلام کا پایہ تخت رہ چکا تھا۔ عسکر میں غزالی کی ملاقات نظام الملک طوسی سے ہوئی۔ خود نظام الملک سلطنت سلاجقہ کے ہر سفید و سیاہ پر قابض و متصرف ہونے کے باوجود ایک بڑا عالم اور ماہر سیاست داں تھا۔ اس نے بغداد میں ایک عربی مدرسۃ العلوم بنایا تھا جو خود اس کے نام سے مشہور ہے۔ اور مدرسۂ نظامیہ کہلاتا ہے۔ نظام الملک نے غزالی کو بغداد روانہ کیا چنانچہ علامہ موصوف ۴۸۴ھ میں بغداد پہنچ گئے۔ سارا شہر بغداد غزالی کے حسن کلام، کمال فضل، فصاحت لسانی، دقت نظر

اوران کے لطیف اشاروں اور غوامض علیہ کا گرویدہ ہوگیا۔ لوگوں کو ان سے گہرا لگاؤ پیدا ہوگیا اور انہوں نے غزالی کو دل میں بلکہ آنکھوں میں جگہ دی اور لوگ ان کی درسگاہ میں دور دراز سے طے مسافت کرکے آتے اور غزالی کے سرچون چشمہ علم و فضل سے فیض یاب ہوتے۔

لیکن عین اس زمانے میں جب کہ غزالی کا آفتاب شہرت اپنے نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ غزالی کی طبیعت میں ایک زبردست انقلاب آیا۔ حضرت شیخ نے ان تمام مناصب و اعزاز کو بالائے طاق رکھ کر حج بیت اللہ کی ٹھانی اور ادائیگی فریضۂ حج کے بعد شام پہنچے اور دمشق میں جامع اموی میں معتکف ہوگئے جامع دمشق کا وہ گوشہ جہاں آپ نے عزلت گزینی فرمائی تھی وہ آج تک آپ کے نام سے موسوم ہے آپ نے اپنی طرز زندگی ہی بدل ڈالی۔ موٹا کپڑا (صوف، جس سے تصوف مشتق ہے) اختیار فرمایا غذا میں کمی کردی اور اپنی مشہور تصنیف احیاء العلوم الدین کے لکھنے میں اپنی ساری توجہ مرکوز کردی۔ اس اثناء میں بہت کچھ سفر کیا۔ مختلف مقابر اور مساجد کی زیارت کرتے رہے اور نفس کے ساتھ سخت مجاہدہ اختیار کیا۔ اور اس کو مختلف مشقتوں، نوع بنوع کی ریاضتوں اور عبادتوں کا عادی بنایا تاآنکہ وہ قطب الوجود ہوگئے اور ہر ایک کے لئے برکتوں کا سرمایہ بن بیٹھے۔ ایک مدت کی سیاحت کے بعد وہ بغداد لوٹے۔ اپنے مکان کے قریب ایک مدرسہ اور خانقاہ بنائی۔ اپنے اوقات عزیز کو عبادت، درس و تدریس، تلاوت قرآن و وظائف پر تقسیم فرمادیا۔ لوگوں کو اپنی کتاب احیاء کا سبق دیتے اور دین کی حقیقتوں سے انہیں باخبر فرماتے۔ اسی طرح بقیہ عمر دین کی خدمت میں بسر فرمادی۔

آپ کی تصانیف میں سے بعض اہم کتابیں حسب ذیل ہیں:۔ البسیط والوسیط۔ شفاء العلیل۔ تہافۃ الفلاسفہ۔ رد علی الباطنیہ۔ منہاج العابدین۔ احیاء العلوم الدین۔ اور المنقذ من الضلال . . . . ان میں سے الاحیاء آپ کی بنایت زبردست اور معرکۃ الآراء کتاب ہے اس میں علامہ موصوف نے مذہب اور اس کے متعلقات کو عقل و حکمت کی روشنی میں پیش فرمایا ہے اور اپنے مقصد کے حصول میں وہ الہامی دلائل و براہین پیش کئے ہیں کہ مخالف عاجز آجاتا ہے اور مومن کے ایمان میں زیادتی پیدا ہوجاتی ہے۔ آج بھی دنیائے اسلام میں یہ مبارک کتاب عربی مدارس کے آخری اور انتہائی درجوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ المنقذ من الضلال جس کے معنی ہیں "گمراہی سے بچانے والی"، یہ کتاب تصوف پر ایک بیش بہا تصنیف ہے۔ چند صفحات میں علامۂ موصوف نے تصوف کے خاص خاص مقامات کو واضح فرمایا ہے گویا کہ آپ نے دریا کو کوزہ میں بند کردیا ہے۔

امام تیمیہ اور ابن جوزی کا بیان ہے کہ امام غزالی . . . . گو علم حدیث میں زیادہ دسترس نہیں تھا۔ ان کا خیال ہے کہ غزالی کی کتابوں میں موضوع الحدیث بہت ہیں اور اکثر و بیشتر معقولات فلاسفہ

بحث کی گئی ہے مگر اس کے جواب میں ابن العربی لکھتے ہیں کہ یہ گمان غلط ہے کہ غزالی محض فلسفی تھے اور اصول فلسفہ کے پابند تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے غزالی کی نسبت فلسفہ کا الزام رکھا ہے وہ ایک اہم حقیقت کو عموماً نظر انداز کر دیا کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ غزالی نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا تھا اس وقت دنیائے اسلام پر فلسفۂ یونان کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ دنیا ایک زبردست انقلاب سے گذر رہی تھی۔ مشیت کا یہ دستور ہے کہ ایک بڑی ضرورت کے لئے ایک بڑے شخص کو کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔ چنانچہ اس دور میں بھی ایسا ہی ہوا۔ فلاسفہ کا جواب دینے غزالی کھڑے ہو گئے اور ان کے فنون کو خود حاصل کر کے ان کا جواب کچھ اس طرح دیا کہ وہ پھر کبھی دنیائے اسلام میں سر نہ اٹھا سکے۔ اگر غزالی نے فلسفہ پڑھا یا فلسفہ لکھا تو یہ سب کچھ اسلام ہی کی خاطر تھا اس سے تو اس امام ہمام کی قدر و منزلت کا پتہ چلتا ہے۔ زمانے کے نئے تقاضوں کو سمجھنا اور ان کا صحیح جواب مہیا کرنا۔ آخر یہی تو زندگی کی نشانی ہے لیکن بقول آیۂ شریفہ **ولکن اکثرھم لا یفقھون** (لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کا ادراک نہیں کرتے) تہافۃ الفلاسفہ میں غزالی نے فلاسفۂ یونان کی ذہنی لغزشوں کا ذکر کیا ہے اور ان کا رد لکھا ہے اور یہ کچھ اس انداز میں کہ پھر ان کے متبعین میں سے کسی سے اس کا جواب بن نہ پڑا۔ اور ظاہر ہے کہ اس خدمت کے لئے غزالی دنیائے اسلام سے شکریہ کے مستحق ہیں نہ کہ اعتراض کے۔ لیکن جب خدا اور رسول بھی چشم بد سے نہ بچ سکے تو پھر دوسروں کو جائے شکایت کیا ہو سکتی ہے۔

امام غزالی نے احیاء العلوم کے ذریعہ جب اپنی زندگی کا مقصد پورا فرما دیا تو آپ نے اپنی ساری توجہ تصوف پر صرف کر دی۔ "المنقذ" اسی دور کی تصنیف ہے۔ آخری عمر میں آپ پکے موحد اور صوفی بن گئے تھے جو آپ کا بالواقع اصلی رنگ یہی تھا۔ بعض ارباب کشف نے صحت معنوی میں حضرت رسالت مآب سے امام غزالی کی نسبت استفسار فرمایا جواب ملا۔ "**ذلك رجل وصل الی مقصودہ**" یعنی یہ کہ یہ شخص وہ ہے جس نے اپنے مقصود کو پا لیا ہے۔ آپ کا مقصد علوم دین کو پھر سے زندہ کرنا تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس مہم میں زبردست کامیابی عطا فرمائی تھی اور یہی مطلب ارشاد نبوی کا ہو سکتا ہے۔

غزالی نے آخری عمر میں سارے علوم ترک کر دئے تھے اور صرف حدیث پر دارومدار رکھا تھا۔ ملا علی قاری کی روایت ہے کہ جب امام غزالی کا وصال ۱۴ جمادی الآخر ۵۰۵ھ یوم دوشنبہ واقع ہوا تو سینۂ مبارک پر صحیح البخاری کی جلد رکھی ہوئی تھی۔

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

ضیا فتح آبادی

جنگ آزادی کے بے نام شہید

اے شہیدانِ وطن، اے جاں نثارانِ وطن اے کہ رنگیں ہے تمہارے خوں سے دامانِ وطن
شمعِ آزادی کے تم پروانۂ جانباز تھے جو عبارت سوز سے ہے وہ نوائے ساز تھے
جاگتے، ہشیار ذہنوں میں جو تھی تصویرِ خواب اک صدی کے بعد آخر بن گئی تعبیرِ خواب
آج صحنِ گلستاں میں رقص فرما ہے بہار ذرّہ ذرہ، پتّہ پتّہ، کامیاب و کامگار
آج ہم آزاد ہیں آباد ہیں دلشاد ہیں جو سبق تم نے سکھائے تھے ہمیں سب یاد ہیں
ہم تمہارے جذبۂ ایثار کے قائل ہیں آج یعنی اپنے ماضیِ مرحوم پر مائل ہیں آج
ہم تمہارے نام سے اچھی طرح واقف نہیں خود بخود دل میں ابھر آئی ہے اک یادِ حزیں
ہم اسی یادِ حزیں کے نورِ ظلمت پاش میں دیکھتے ہیں روئے فردا کی جھلک آکاش میں

تم کہیں بھی ہو تمہارے کام کو حاصل دوام
اے شہیدوں کی مقدس، پاک تر روحو سلام

رشی پال

ریڈیو ڈرامہ (ایک تقریر)

خواتین و حضرات!

آج کی اس صحبت میں میں ریڈیو ڈرامہ کے فنی، تکنیکی اور ادبی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کی تشکیل و تکمیل سے متعلق صرف تخلیقی عناصر کا ہی ذکر کروں گا۔ ہمارے سٹوڈیو سے لے کر آپ کے سیٹ تک کیسے پہنچتا ہے۔ اس کے سائینسی یا برقی اجزائے ترکیبی کیا ہیں ان کا تذکرہ خارج از بحث تصور فرمایا جائے۔ علاوہ ازیں میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مختصر ریڈیو ڈرامے کے متعلق جو کچھ میں عرض کروں گا وہ صرف بحیثیت ایک فن اور صنف ادب کے طور پر ہی ہوگا۔ اس کا تعلق آل انڈیا ریڈیو کے سرکاری ادارے سے کوئی نسبت نہیں رکھتا ہے۔ یہ شروع سے ہی اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں اور اس کا مجھے کسی حد تک افسوس بھی ہے کہ ہمارے ملک میں ریڈیو ڈرامہ کو ابھی تک صنف ادب کے طور پر مستقلاً کوئی مقام نہیں دیا گیا جس کا کہ یہ ہر حالت میں مستحق ہے۔ ہماری زبان کے جن مقتدر اور نامور ادیبوں نے ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھے ہیں۔ اور جو بے حد کامیاب بھی رہے۔ جب انہیں چھپایا گیا تو عام اسٹیج کے ڈراموں کے طور پر ہی وہ سب قارئین کے سامنے پیش کئے گئے۔ جس سے کہ ان کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو گیا حالانکہ ریڈیو ڈرامہ بجائے خود ایک فن کی حیثیت رکھتا ہے اور سٹیج یا اسکرین سے اس کی تکنیک واضح طور پر مختلف ہے۔ آپ کو شاید علم ہو کہ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اپندر ناتھ اشک اور سعادت حسن منٹو ایک زمانے میں آل انڈیا ریڈیو سے باقاعدہ طور پر منسوب تھے اور اپنی ملازمت کے دوران میں انہوں نے کئی معرکہ خیز ریڈیو ڈرامے لکھے لیکن جب یہ ’دروازہ‘ ’سات کھیل‘ یا ’منٹو کے ڈرامے‘ کے عنوان سے کتابی صورت میں ظہور پذیر ہوئے تو یہ اپنا پیدائشی رنگ کھو چکے تھے اور ان سب کے ساتھ باقاعدہ طور پر اسٹیج کی ہدایات دی ہوئی تھیں جن کا کہ ریڈیو ڈرامہ ہونے کی حیثیت سے کوئی مقام تھا نہ ضرورت۔ الغرض اس ادبی بے رخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریڈیو ڈرامہ بحیثیت ایک صنف ادب کے ابھی تک کوئی مقام حاصل نہیں کر سکا۔

میں نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ ریڈیو ڈرامہ اسٹیج ڈرامہ سے تکنیک اور فن کے لحاظ سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اسٹیج پر جب ہم کوئی کھیل دیکھتے ہیں تو اس کی اپیل یا اس کا رخ ہماری آنکھوں کی طرف رہتا ہے۔ لیکن ریڈیو ڈرامہ کو اپنا سارا تاثر ہمارے کان کے ذریعے ہی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ ہمارے ذہن کے پردوں پر الفاظ اور دوسرے صوتی اثرات ہی سے اس کے تانے بانے کی جھلک پیدا ہو سکتی ہے۔ لہٰذا فن کاروں کی اچھل کود ہاتھوں کے اشارے، ابروؤں کی شکنیں اور دوسرے

پیشہ اور اسٹیج کے کرتب ریڈیو ڈرامے کے لئے بالکل بیکار ہیں۔ یہاں تو جو بھی تاثر پیدا کرنا ہے وہ الفاظ اور دوسرے صوتی اثرات کی مدد سے ہی ممکن ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی اسٹیج کے ڈرامے میں ہمارے ہیرو کو کوئی شدید جذباتی صدمہ پہنچا ہے (جیسا کہ تقریباً سبھی ہیروؤں کو جذباتی صدمے پہنچتے ہی رہتے ہیں ورنہ وہ ہیرو کس بات کے ہوئے) اور اس کی تصویر کشی مقصود ہے تو ہم بڑی آسانی سے اس کا چاک گریباں، کھلے اور بکھرے ہوئے بال، ہفتوں کی شب بیداری سے بوجھل پپوٹے القصہ وحشت کی اس کیفیت کے اظہار کے لئے دوسرے ایسے کئی تاثرات سے کام لے سکتے ہیں لیکن ریڈیو ڈرامے میں یہ سب بے معنی ہیں وہاں تو ہمیں دوسرے کردار کی زبان سے اس کی کیفیت بیان کروانی ہوگی مثلاً ہیرو کا دوست جب اسکے ملنے آتا ہے تو انتہائی ہمدردی سے اسے پوچھتا ہے۔

"کیا بات ہے دلیپ، تمہیں ہوا کیا ہے۔ تمہارے بال بکھرے ہوئے کیوں ہیں۔ آنکھوں سے وحشت کیوں برس رہی ہے، ایسا لگتا ہے کہ تم نے مہینوں سے آنکھ نہیں جھپکی۔"

الغرض ذہنی پریشانیوں اور ایسی دوسری کیفیتوں کے اظہار کے لئے بھی ہمیں مکالموں کی ہی ضرورت ہوگی خواہ اسے دوسرے کردار کی معرفت سامعین تک پہنچایا جائے یا مرکزی کردار خود اپنے آپ سے ([illegible]) کے ذریعے بیان کرے۔ لیکن میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ ریڈیو میں ([illegible]) بھی کچھ موزوں نہیں بیٹھتی اور بہتر طریقہ یہی ہے کہ دوسرے کے [illegible] یا ڈرامائی مواقع کے

ذریعے ذہنی کشمکش یا ایسی دوسری کیفیتوں کی تصـ[illegible] کشی کی جائے۔

لیکن خدارا یہ نہ سمجھئے کہ میں آپ کو ریڈیو ڈرامے لکھـ[illegible] یا پیش کرنے کے لئے کوئی آزمودہ یا تیر بہدف نسخے بتا[illegible] کر رہا ہوں۔ میرا مقصد تو صرف اس کی تکنیک کے متـ[illegible] کچھ بنیادی اصول بیان کرنا ہے۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ ریڈیو ڈرامہ کی اپیل ہماری آنکھوں کو نہیں بلکہ صرف ہمارے کانوں کو ہے۔ اس لئے ہمیں سبھی تاثرا[illegible] آواز اور دوسرے صوتی ذرائع سے ہی پیدا کرنے ہیں [illegible] ایک بات جس میں ریڈیو ڈرامہ اسٹیج سے اور طریقے سے بھی مختلف ہے۔ وہ ہے وقت اور مقام کی تبدیلی۔ اسٹیج پر یہ تبدیلی اور وقفہ عام طور پر ایکٹ اور مناظر کی تقسیم سے پردے کے گرانے اور اٹھانے سے پیش کیا جاتا ہے لیکن ریڈیو ڈرامہ میں منظر نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہاں ایسے ڈرامائی مواقع جن میں پس منظر بدلتا ہے۔ صرف معمولی وقفوں یا موسیقی کی لہر کی مدد سے ہی [illegible] تبدیل ہو جاتے ہیں اور ذہن پر کوئی بوجھ نہیں پڑتا اور مرکزی چاٹ یا تقسیم کا سلسلہ کسی صورت میں ٹوٹنے نہیں پاتا۔ علاوہ ازیں فرض کیجئے آج کے دور [illegible] کسی داستان گو کو زمانۂ سلف کی کوئی کہانی سنانا مقصود ہے تو جہاں یہ اسٹیج کے لئے اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔ ریڈیو پر اسے آسانی سے بغیر کسی دوسرے کے [illegible] کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح راوی کی مدد سے جیسا کہ [illegible] کی سنسکرت ناٹک میں سوتر دھار کے ذریعے [illegible] ستان کا استرجمت کیا جاتا تھا۔ آج کے [illegible] تاثر پیدا کرنا مشکل نہ معلوم ہوگا لیکن ریڈیو [illegible]

تسلیم شدہ اور مستند طریقہ سمجھی جاتی ہے۔ ریڈیو میں کہانی کا راوی بجائے خود ایک کردار بن جاتا ہے اور خواہ اس کا مرکزی کردار سے براہ راست واسطہ ہو یا نہ ہو اس کی بجائے خود ایک حیثیت ہے اور وہ کہانی کے تار و پود کو ایک ساتھ جوڑنے کا واحد ذریعہ بن جاتا ہے۔ اسٹیج پر ایسے راوی کی حیثیت آج زیادہ سے زیادہ اس مزاحیہ جوکر کی سی ہوتی ہے سرکس یا جادو کے کرتب دکھانے والے شو کے باہر ہجوم جمع کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں مگر ریڈیو ڈرامے کے لئے یہ بجائے خود ایک اہم کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اکثر اوقات ایسے ڈراموں میں راوی کو چشم دید گواہ کے طور پر یا کہانی کی دوسری ڈرامائی الجھنوں سے خود گزرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے اور اس سے ڈرامہ کا حسن اور بھی نکھر جاتا ہے . . .

. . . .

اس نکتہ کی مزید وضاحت کے لئے میں اپنے ڈرامہ سوہنی مہینوال کا ذکر کروں گا۔ سوہنی مہینوال سرزمین پنجاب کا ایک کلاسیکی رومان ہے اس میں مغلیہ شہنشاہ شاہجہاں اپنی بیگم ممتاز محل کو سوہنی مہینوال کی داستانِ غم سناتا ہے۔ مگر مہینوال کو سوہنی کے ہاں بھیجنے کا ذمہ دار خود شہنشاہ شاہجہاں ہی ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اس قصے میں انجانے میں ہی ایک اہم کردار بننے کا موجب بن جاتا ہے مگر جہاں تک ڈرامے کے موضوع اور پلاٹ کا تعلق ہے اس کی حیثیت راوی سے زیادہ نہیں۔ لیکن سامعین کی دلچسپی اس کے مرکزی کرداروں کی زندگی سے وابستہ ہونے سے اور بڑھ جاتی ہے۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ ریڈیو ڈرامہ میں ہیں سب تاثرات صوتی اثرات سے ہی پیدا کرنے پڑتے ہیں۔ لہٰذا مکالموں کی اہمیت سے قطع نظر ریڈیو ڈرامہ میں صوتی اثرات اور موسیقی کا ایک خاص مقام ہے آپ نے اکثر ڈراموں میں بارش، طوفان، کار کے چلنے اور چھوٹنے ریل گاڑیوں کی ٹکر اور جوالا مکھی پہاڑوں کے پھٹنے کی آوازیں سنی ہوں گی۔ اس کے لئے ریڈیو کے پیشکاران صوتی اثرات کے ریکارڈ جو پہلے سے ہی تیار کئے ہوتے ہیں استعمال کرتے ہیں۔ بعض اوقات ضرورت کے مطابق خاص خاص موقعوں کے لئے ان اثرات کے ریکارڈ اصلی مقامات پر بھی جا کر تیار کرلئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس خاص منظر کو پیش کرنا ہو اس کے لئے فی الواقعی ہی ایسے مناظر کی فلموں کی طرح فلم بندی کی جائے۔ مثال کے طور پر اگر کہیں تباہ کن آگ لگی ہوئی دکھانا مقصود ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اس وقت تک کا انتظار کیا جائے کہ کسی بڑی بلڈنگ کو آگ لگے اور ہم لوگ اپنا ساز و سامان اٹھا کر موقع پر پہنچ کر آگ کا ریکارڈ کرلیں۔ مضحکہ خیز ہونے کے علاوہ تجربہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ مصنوعی ذرائع سے نہ صرف آسانی سے بلکہ زیادہ وفاداری کے ساتھ اور حقیقت سے قریب ترین اثرات پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً آگ کے متعلق ہم سگریٹ کے پیکٹوں کے اندر جو سفید چاندی نما کاغذ رہتا ہے اسے مائکروفون کے قریب ہاتھوں سے رگڑنے سے بڑی آسانی سے اور بالکل حقیقی رنگ میں پیش کر سکتے ہیں۔ اسی طرح گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سولہیٹ یا ضخیم کتاب پر ایک خاص انداز سے انگلیاں ٹکرانے سے بڑی آسانی سے پیدا کی جا سکتی ہے اور سامعین کو

یسا محسوس ہوتا ہے جیسے میدان کارزار میں ہزار ہا گھوڑے ایک ساتھ دوڑ کر جنگ کا وحشت ناک منظر پیدا کر رہے ہیں۔

جہاں تک موسیقی کا تعلق ہے میں نے عرض کیا تھا کہ اس کا بھی ایک اہم مقام ہے۔ اکثر جذباتی الجھنوں یا نقطۂ عروج پر پہنچتے وقت اکثر پیشکار موسیقی اثرات کا استعمال کرتے ہیں لیکن اس میں کسی حد تک احتیاط کی ضرورت لازمی ہے۔ اکثر اوقات موسیقی مکالموں کی اہمیت ختم کر دینے یا کم کرنے کا باعث بن جاتی ہے اور سامعین کی توجہ اصلی موضوع یا ڈرامائی کیفیت سے ہٹ جاتی ہے لہٰذا یہ کوشش ضرور کرنی چاہیئے کہ موسیقی کا استعمال صرف وہیں کیا جائے جہاں اس کی ضرورت ہو اور جس سے ڈرامائی تاثر بڑھانے میں مدد مل سکتی ہو ورنہ اکثر اس کا اثر الٹا ہی بیٹھتا ہے۔ حال ہی میں بی، بی، سی لندن کے ایک مشہور ڈرامہ پروڈیوسر مسٹر ہاورڈ روز جو اب اس ادارے سے علٰحدہ ہو چکے ہیں کا ایک مضمون میری نگاہ سے گذرا ہے جس میں انہوں نے ریڈیو ڈرامہ میں موسیقی کے استعمال کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ مجھے ان سے پوری طرح اتفاق نہیں ہے اور میں موسیقی کو ڈرامائی تاثر کو بڑھانے اور تیز کرنے میں حقیقی مدد و معاون سمجھتا ہوں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس کے استعمال میں احتیاط لازمی ہے۔ جگہ اور مقام کی تبدیلی ہم دوسرے صوتی اثرات سے بھی دکھا سکتے ہیں اور معمولی تبدیلی مناظر تو صرف ملحاقی دھنوں سے بھی پیش کی جاتی ہے میں نے ابھی تک جو کچھ عرض کیا وہ صرف خالص ریڈیو ڈرامے سے متعلق تھا یعنی وہ ڈرامہ جسے عرف عام میں ناٹک یا کھیل کہا جاتا ہے اور جس میں ایک منصوبہ دار پلاٹ یا تھیم پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن ریڈیو ڈرامے سے ملتی جلتی دوسری اصناف بھی کچھ ایسی ہیں جو اس نام سے رائج ہیں یا ڈرامے کے تحت ہی کم و بیش آتی ہیں وہ ہیں روپک یعنی Feature سنگیت روپک یعنی Musical Feature اور مزاحیہ ڈرامئی ان کے علاوہ دستاویزی روپک Documentary Feature پر بھی آج کل بہت زور دیا جا رہا ہے۔

روپک کو آپ کسی مناسب لفظ کی عدم موجودگی میں ایک ایسا ہوائی خاکہ سمجھ سکتے ہیں جس کی بنیاد کسی حقیقی واقع، کردار یا سماجی و سیاسی اعتقاد یا اصولوں پر رکھی گئی ہو۔ اگر اس میں موضوع کی وضاحت کے لئے قدرے زیب داستاں سے کام بھی لیا جائے تو اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا یا ڈرامائی رنگ کے لئے کلیتاً تاریخی حقائق نہ بھی ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ مثلاً اگر شیل پر جب ہم کوئی فیچر یا روپک پیش کرنا چاہیں۔ تو مہاتما بدھ، مہاراجہ اشوک حضرت عیسیٰ اور ایسے دوسرے مہاپرشوں کے پرچار اور زندگی پر مبنی ان تمام واقعات اور اصولوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے جن کا ذکر ہمیں تاریخ کی ٹیکسٹ کی کتاب میں چاہے نہ ملے لیکن عوام نے پشت در پشت ان واقعات کو سنا ہو اور بنی نوع انسان کی بہبودی اور فلاح کے لئے ڈرامائی رنگ میں آسانی سے پیش کئے جا سکتے ہوں۔ اس طرح حضرت غالب کی زندگی سے متعلق دلچسپ واقعات کو ڈرامائی رنگ دینے میں ہمیں تخیل سے کام لینے کی ضرورت نہیں۔ بنیادی طور پر ریڈیو فیچر ایک ایسا ہوائی خاکہ ہے جسے ڈرامائی رنگ میں پیش کیا جائے مگر اس کا مرکزی خیال یا کردار تاریخی، ادبی یا سماجی و معاشی پس منظر

ضرور رکھتا ہو۔ لیکن یہ خیال ضروری ہے کہ ایسے واقعات یا کرداروں سے پرہیز کیا جائے جو بالکل ہی حقیقت سے بعید ہوں اور وہ تاریخ کی کسوٹی پر بالکل ہی پورے نہ اترتے ہوں۔ مختصر یہ کہ ریڈیو فیچر حقیقت اور مجاز کا ایسا امتزاج ہے جس میں فوقیت بہرحال حقیقت کو ملنی چاہئے۔ صرف زیب داستان کے لئے اگر مستند تاریخ سے کسی حد تک دست درازی ہی ہو جائے تو جیسے انگریزی میں شاعرانہ مبالغہ قابل عفو سمجھا جاتا ہے اسے بھی درگذر کر دیا جاتا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو ہر سال مختلف مشہور و معروف شاعروں کی برسیاں مناتا ہے اور ان کی زندگی اور کلام سے متعلق ایسے روپک پیش کرتا ہے۔ حال ہی میں مجھے مرزا غالب کی زندگی پر دو روپک سننے کا اتفاق ہوا۔ ایک پنجاب کے کہنہ مشق شاعر اور ادیب جناب فکر تونسوی کا لکھا ہوا تھا اور دوسرے کا مصنف جالندھر کا ایک نوجوان اور ابھرتا ہوا فنکار پریم جوشی ہے۔ دونوں فیچر اپنی اپنی جگہ پر خوب تھے اور جہاں حضرت فکر نے غالب کے فلسفۂ حیات کو جدید سماجی و معاشی قدروں کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی وہاں پریم جوشی نے ان کی زندگی کے ان واقعات کو ڈرامائی رنگ میں پیش کیا جس سے مرزا کے مخصوص مزاحیہ انداز، بذلہ سنجی اور تلخیٔ دوراں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے کی عادت اور ان کی ذات کی دوسری خوبیاں آشکار ہو سکیں۔ پریم جوشی نے ویسے کچھ اور بھی اچھے اور دلچسپ تاریخی روپک لکھے ہیں جو ریڈیو پر بہت مقبول ہوئے ہیں۔

ریڈیو ڈرامے کی تیسری قسم سنگیت روپک کی ہے۔ اس میں گیتوں پر زور زیادہ ہوتا ہے اور ڈرامائی کیفیت اور ان کا گوناگوں اظہار بہت کم ہوتا ہے۔ عام طور پر ان روپکوں میں تہواروں، میلوں یا موسم کی رنگینیوں کا ذکر دلچسپ گیتوں کے ذریعے مادی کی مدد سے کیا جاتا ہے ہندی میں اس کا رواج زیادہ ہے اور اس زبان کے مقتدر شاعروں اور ادیبوں نے بعض بہت اچھے سنگیت روپک پیش کئے ہیں۔ اس سلسلے میں شری شمرانندن پنت کی 'جیوتسنا' کا ذکر غیر مناسب نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ ایسے روپکوں میں دیومالا اور ثقافتی پس منظر کو بھی موسیقی اور سنگیت کے ذریعے آشکار کیا جاتا ہے۔ الغرض تخیل اور سنگیت کا امتزاج اس صنف کی خصوصیت ہے۔

ریڈیو ڈرامہ کی چوتھی قسم مزاحیہ ورائٹی کی ہے اس کا ڈھانچہ اور ظاہری تشکیل تو ڈرامے کی ہے۔ لیکن اس میں کردار نگاری اور لطیفہ گوئی کو مزاحیہ پیرائے میں پیش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس صنف میں مکالموں کی چستی، برجستگی اور اداکاری کے لئے بہت امکانات ہوتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں ابھی اسے کوئی خاص ہر دلعزیزی حاصل نہیں ہو سکی ریڈیو کے لکھنے والوں نے ابھی اس طرف پوری توجہ نہیں دی یا شاید ہم ہندوستانی فطرتاً کچھ فلاسفر نما واقع ہوئے ہیں اس لئے مزاح اور بذلہ سنجی ہماری روز مرہ کی زندگی میں کوئی خاص مقام حاصل نہیں کر سکی۔ بہرکیف وجوہات کچھ بھی ہوں ریڈیو ورائٹی کو ابھی مزید توجہ اور محنت درکار ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنے آپ حاصل ہو جائے گی۔ بی بی سی لندن کا اس قسم کا

مزاحیہ پروگرام اسٹم ا (اسٹما) کے نام سے بریشنے والوں سننے والوں کی تفریح و تفنن کا باعث ہوتا ہے۔

اور آخر میں میں ریڈیو ڈاکیومنٹری فیچر کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ ان ادیوں میں ڈرامہ یا زیب داستان کی کوئی گنجائش نہیں۔ عام طور پر یہ مشہور تاریخی مقامات، تیرتھ، استھان یا ایسے ہی دوسرے سماجی و معاشی واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں قومی تعمیر اور ارتقاء کے لئے ہمارے ملک میں اس وقت جو پروجیکٹ اور اس قسم کا دوسرا کام ہو رہا ہے ان کو منظر عام پر لانے کے لئے ایسے ادیوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ ان پروجیکٹوں میں کام کرنے والے افسر، کاریگر اور دیگر ملازموں کی روزمرہ زندگی اور اس سے متعلقہ مسائل، تعمیر و تشکیل کے مختلف مراحل اور ذرائع، مشینوں کے چلانے کے طریقوں اور اسی قسم کی دوسری چیزوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ پیش کار خود وہاں پہنچ کر ان لوگوں سے ملاقات کرتا ہے۔ ان کے تاثرات ریکارڈ کرتا ہے۔ اور ان کی تفریح اور کام سے متعلقہ سبھی ذرائع کو دیکھ کر ایک رپورٹ تاثر کی صورت میں ریڈیو پر پیش کرتا ہے۔ اس میں اس بات کی خاص احتیاط رکھی جاتی ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے وہ سو فیصدی حقیقت پر مبنی ہو اور عوام میں قومی ارتقا سے متعلقہ تعمیری کاموں کے لئے دلچسپی پیدا کی جا سکے۔ ابھی اس مہینے کی ۲۱ر تاریخ کو آپ کے شہر مدراس میں جو انٹیگرل کوچ فیکٹری [illegible] ہے اس پر مبنی ایک حقیقی فیچر ریڈیو سے ۱۰ بجے نشر ہوگا۔ ایسے ادیوں میں خود موقع پر جا کر کام کرنے والے حضرات سے انٹرویو کیا جاتا ہے۔ فیکٹریوں میں چلنے والی مشینوں کی آوازوں کو ریکارڈ کیا جاتا ہے اور مقصد یہی ہوتا ہے کہ صوتی اثرات سے ان لوگوں کی زندگی کی صحیح طور پر جیتی جاگتی تصویر پیش کی جا سکے۔

ریڈیو ڈرامہ کی ایک اور صنف کا بھی مجھے اس وقت خیال آیا ہے جس کا ذکر میں کئے دیتا ہوں، یہ ہے مشہور ناولوں اور کہانیوں کا ریڈیائی روپ۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہر ڈرامے کے لئے ایک خاص وقت اور مقررہ میعاد ہوتی ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ریڈیو ڈرامہ ایک گھنٹے سے زیادہ دلچسپی قائم نہیں رکھ سکتا۔ اور چونکہ صرف ڈرائنگ روم میں ہی سنا جا سکتا ہے جبکہ آپ ساتھ ساتھ دوسرے کام بھی کر سکتے ہیں یا جہاں پورا انہماک ممکن نہیں جیسا کہ اسٹیج یا فلم میں ہو سکتا ہے۔ اس لئے ان ریڈیائی روپوں کی تشکیل کے لئے خاص احتیاط اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بڑے بڑے ناول یا طویل مختصر کہانیاں ساری کی ساری اسی صورت میں پیش نہیں کی جا سکتیں۔ قطع و برید لازمی ہے مگر کونسا حصہ حذف کیا جائے اور کس پر زور دیا جائے، اس کے لئے ڈرامائی آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ایسے روپانتروں میں ریڈیائی روپ دینے والا خود اپنی طرف سے مکالموں میں اضافہ کر سکتا ہے مگر اس کے لئے اصلی مصنف کے اسلوب اور انداز تحریر کی تقلید لازمی ہے ورنہ اپنی طرف سے لکھے ہوئے مکالمے مخمل پر ٹاٹ کا پیوند نظر آئیں گے۔ کہانیوں میں ایک وقت یہ بھی ہوتی ہے کہ ان میں عالی

پبلک کے مقابلے اکثر اوقات کم رہتے ہیں اور روایت اور منظر کشی زیادہ ہونے کی وجہ سے ڈرامائی دلچسپی برقرار نہیں رہتی اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ صرف ایسی کہانیوں کا انتخاب کیا جائے جن میں حرکت یا ایکشن ہو اور جو باقاعدہ لفظ' عروج کی حامل ہوں ناولوں کو ریڈیائی روپ دینے میں اس بات کا خیال رکھا جانا چاہئے کہ غیر ضروری کردار یا واقعات بالکل خارج کر دئے جائیں جن کا مرکزی خیال یا کہانی سے کوئی براہ راست واسطہ نہ ہو۔ پلاٹ کا پیرایہ غیر ضروری الجھنوں اور اڑچنوں سے پاک ہو اور سامعین خواہ مخواہ کے گورکھ دھندوں سے بچ سکیں ورنہ ان کی دلچسپی کا سلسلہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اس ضمن میں میں منشی پریم چند کے مشہور ناول 'میدان عمل' کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جسے ریڈیو کے لئے میرے محترم دوست اور ساتھی جناب ایاز انصاری نے ترتیب دیا تھا۔ یہ ایک قابل قدر کوشش تھی اور فاضل روبانسر کار نے اسے بڑی محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا تھا۔ اچھے ناولوں کے ریڈیائی روپوں میں یہ ایک خاص مقام رکھتا ہے۔

آج اس مختصر صحبت میں' میں نے ریڈیو ڈرامہ کے معرض وجود میں آنیکے صرف ابتدائی مراحل کا ہی ذکر کیا ہے۔ اس کی پیشکش اور پایۂ تکمیل تک پہنچنے میں جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسکا ذکر کبھی کرونگا۔

عبدالجبار خاں سیفؔ

(ہر اشک بھی طوفاں ہو جائے)

اللہ کے خوف و دہشت سے جو آنکھ بھی گریاں ہو جائے
عصیان و خطا کی بستی میں ہر اشک بھی طوفاں ہو جائے

جل جاؤں جو پروانہ بن کر فانوسِ رسالت پر ہمدم
یہ ارض و سما ہوں مجھ پہ فدا فردوس بھی قرباں ہو جائے

اس قوم کی بربادی میں آخر کیوں شبہ کسی کو لاحق ہو
جس قوم کے رہبر کے گھر میں رہزن مہماں ہو جائے

امید تھی گل کی خار ملا اُف اپنی وفاداری کا صلہ!
صیاد سے کیا امید وفا دشمن جو گلستاں ہو جائے

شیطاں تو خدا کے بندوں کو گمراہ کیا کرتا ہے مگر
اصلاح کی کیا امید اگر انساں ہی شیطاں ہو جائے

اے سیفؔ بھلا یہ اردو زباں ہو جائے فنا کیوں دنیا سے
جب اپنے وطن کا ہر شاعر پھر اس کا نگہباں ہو جائے

دورِ جنوبی ہند میں اردو

(مسلسل)

تاج

مولانا محمد تاج الدین تاج ترچناپلی کے باشندے ہیں آپ کے والد بزرگوار اردو اور فارسی کے کامل استاد تھے شعر گوئی کی ابتدا اس وقت ہوئی جب آپ نے عمر کی چودہ منزلیں طے کی تھیں۔ حضرت مولانا آغائی مصنف "گلشن سیرت" کے شاگرد رشید ہیں۔ آج کل اسلامیہ ہائی اسکول میل وشارم میں اردو کے مدرس ہیں۔ کلام خوبصورت ترنم سے پڑھتے ہیں۔ کچھ دنوں سے طبیعت میں مولویت غالب ہے مگر شعر شگفتہ کہتے ہیں۔

ہجر کی رات اب سحر سی ہے
زندگی یوں بھی مختصر سی ہے

کس قدر ان پہ اوس سی ہے
لالہ زاروں کی آگ ترسی ہے

یوں حجابات اٹھتے جاتے ہیں
ہر نظر ماحصل نظر سی ہے

تاج کے دل کو کس نے موہ لیا
اس کی حالت ہی اب دگر سی ہے

ناصر کرنولی

جناب ناصر کرنولی (آندھرا) کے ایک جواں سال اور صاحب مستقبل شاعر ہیں۔ لے ہے۔ اردو ... سہار ... کے ساتھ مشاعرہ ۱۹۵۸ء میں آپ کو قریب سے سننے اور دیکھنے کا موقعہ ملا۔ آپ کلام نہایت دلکش انداز سے پڑھتے ہیں۔ ترنم کے ساتھ ادائیگی میں جو جاذبیت ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ آپ کا کلام کبھی کبھی شمالی ہند کے رسائل میں نظر آجاتا ہے۔ شعر فکر و کاوش سے کہتے ہیں۔ ترقی کے راستے پر رواں دواں ہیں۔

ترے پرتوِ حسن کے ہیں کرشمے،
کہاں نور ہے کس میں تابندگی ہے؟
نہ جینے میں لذت نہ مرنے کی خواہش
خدا جانے کس موڑ پر زندگی ہے!
مرادا بن شوق اور ان کے آنسو
فلک پر ستاروں کی محفل سجی ہے

دانش فرازی

آپ آمبور کے رہنے والے ہیں۔ کبھی دانش اعظمی تھے۔ اب تھوڑے دنوں سے دانش فرازی بن گئے ہیں۔ غالباً یہ نام . . . . . کی آخری تبدیلی ہے۔ صوبۂ مدراس نے ابھی تک صرف ایک ترقی پسند شاعر پیدا کیا ہے اور وہ آپ کی ذات گرامی ہے۔ نوجوان ہیں اور اپنے مستقبل کو سنوارنے میں کوشاں۔ آپ کے کلام میں

ترقی پسند ادب کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ آپ کا کلام ترقی پسند رسائل خصوصاً شاہراہ دہلی میں اکثر چھپتا ہے۔ سنا ہے کہ آپ ماہنامہ "منزل" مدراس کے مدیر دوسری اور سرپرست ہیں۔ آپ مشاعروں کے شاعر نہیں۔ آپ کے کلام میں شاعرانہ صلاحیتیں موجود ہیں اور اگر دوستوں کی مدح وستائش سے آپ نے غلط اثر نہ لیا تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی شاعری کا مستقبل شاندار بن سکتا ہے۔ آپ کو زبان وبیان کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

خام ہے ذوقِ جنوں ہاں کچھ اندھیرا ہے ابھی
چاک ہو جائے گریباں نور کی باتیں کریں

اعترافِ جرم پر مجبور کر دیتے ہو تم،
پھر یہ کہتے ہو کہ ہم دستور کی باتیں کریں

سروش داؤدی

جناب حبیب خاں سروش داؤدی آرٹس کالج مدراس میں پروفیسر ہیں۔ السنۂ شرقیہ کی تدریس آپ کے سپرد ہے۔ ادارۂ عمرآباد میں عربی فارسی کی تعلیم حاصل کر چکے ہیں، ذہن وفکر میں پختگی کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ غزل پر نظم کو ترجیح دیتے ہیں مگر غلط قسم کے نظم گو شعراء کی طرح غزل کے دشمن نہیں ہیں زبان وبیان کی صحت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ آپ ان چند شعراء میں سے ہیں جن کا ذکر "مدراس میں اردو" نامی کتاب میں آیا ہے۔ قدیم وجدید دونوں کے بیچ جو راستہ ہے آپ اسی پر گامزن ہیں۔ وسیع مطالعہ گہری نظر اور غور وفکر کی چنگاریاں آپ کے کلام میں ہر کانی

موجود ہیں۔ اردو کی خدمت کی فکر شب وروز لگی رہتی ہے اور کچھ نہ کچھ بحث کرتے رہتے ہیں۔ شعر تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ دوست نوازی میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے۔

جنوں میں ہم نے کیسے کیسے گل بوٹے کھلائے ہیں
گلستاں کو بھی رشک آنے لگا رنگِ گلستاں پر

سروش خوشنوا جب سازِ دل کو چھیڑ دیتا ہے
برس جاتے ہیں کیا پُر نور نغمے ہر غزل خواں

ابوالجلال

جناب ابوالجلال مدورہ شریف کے رہنے والے ہیں مگر [illegible] سے مدراس میں مقیم ہیں۔ اس لئے خالص مدراسی بن گئے ہیں۔ مدراس کے ادبی حلقوں میں آپ کی ذاتِ گرامی بڑی معتبر رہی ہے۔ وقت پسند ہیں اور وسیع مطالعہ کے قائل ہیں۔ جو بات کہتے ہیں یا لکھتے ہیں وزن دار ہوتی ہے۔ سرسری گفتگو کے قائل نہیں۔ مدراس سے رسالے بھی شائع کرتے رہے ہیں مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ مولوی ہوتے ہوئے بھی وسیع الفکر واقع ہوئے ہیں۔ جو شخص دس پندرہ منٹ آپ کے ساتھ گزار لیتا ہے۔ آپ کی علمیت اور انسانیت کا قائل ہو جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ آپ کو کام کرنے کی طرح کام کرنے کا موقع حاصل نصیب نہیں ہوا۔ شعر بہت کم کہتے ہیں مگر جو کچھ کہتے ہیں کمال ہوتا ہے۔

تم کرو دنیا کا نظارہ سب سے
میری ہستی رہی رہی نہ رہی

انجمن میں ہوں بے ہمہ ایسے
زندگی جیسے زندگی نہ رہی
غیر کے ساتھ دشمنی نہ رہی
اور اپنوں سے دوستی نہ رہی

آسی ترپاتوری

ترپاتور، وانمباڑی کے قریب ایک چھوٹا شہر ہے جناب آسی ترپاتوری وہیں کے رہنے والے ہیں۔ آپ صوبۂ مدراس کے استادانِ فن میں شمار ہوتے ہیں۔ علامہ ناطق گلاؤٹھی کے شاگرد رشید کی حیثیت سے آپ کو فنِ شعر کے نشیب و فراز سے مکمل واقفیت حاصل ہے۔ قدیم وضع اور قدیم رنگ کے حامی ہیں۔ طبیعت میں انکساری کا جذبہ غالب ہے۔ آپ نے شاعری کو پیشہ نہیں بنایا ہے۔ ذریعۂ معاش حکمت ہے۔ جس میں آپ بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ آپ کا شمار صحیح طور سے اگلے وقتوں کے لوگوں میں کیا جا سکتا ہے باوجود عمر کلام میں رنگینی و شوخی کی مثالوں کی کمی نہیں۔ آپ بسیار گو ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ آپ کا کلام مجموعی حیثیت سے شائع ہو کر ملک میں آئے تاکہ معلوم ہو سکے کہ دور مدراس میں بھی اردو شعر کہنے والے موجود ہیں۔

ہم کبھی نالہ و فریاد سے آگے نہ گئے
شکوہ ہائے ستم ایذا دہ سے آگے نہ گئے
تذکرے عشق کے جب بوالہوسوں میں آئے
قوت بازوئے فرہاد سے آگے نہ گئے
منزل بیخودی شوق میں رکھا نہ قدم
حسرت ان پر جو تری یاد سے آگے نہ گئے

جو چار تار مرے پیرہن کے کام آئے
خوشا نصیب وہ دیوانہ پن کے کام آئے
ہوئے تھے عشق و محبت جو ودیعت دل
وہ ولولے مرے حسن سخن کے کام آئے
اٹھا لیجئے نہ قیامت سے پہلے آپ اسے
کہ یہ حجاب بھری انجمن کے کام آئے

نذیر بنارسی

تاثرات

رباعی

وہ بھی وہی ان کی وضعداری بھی وہی ماحول بھی ماحول پہ طاری بھی وہی
تفسیر کلام حق[۱] ہیں عبد الوہاب[۲] مسلم بھی وہی ہیں اور بخاری[۳] بھی وہی

منزل کی طرف بڑھ ہی گئے اہل کمال ناکامی کو ہونا ہی پڑا خواب و خیال
لیتا ہے قدم بڑھ کے جلال[۴] مدراس اللہ رے دوشیزۂ اردو کا جمال

قطعہ

ایسا بندہ تو نے بھیجا اے خدا مدراس میں گونجتی رہتی ہے حق[۵] حق کی صدا مدراس میں
ہو چکی تھی جاں بلب دوشیزۂ اردو نذیر وہ تو کہئے مل گیا آب بقا مدراس میں

ہر ایک دل پہ محبت کا راج دیکھ لیا گہر فشاں سر اردو پہ تاج دیکھ لیا
نذیر خطۂ اردو ہے خطۂ مدراس جناب قمر[۶] سے سنا تھا آج دیکھ لیا

---

۱ الحاج مولوی عبدالحق صاحب۔ ۲ اور ۳ الحاج مولوی سید عبدالوہاب صاحب بخاری
۴ جلال الدین سکرٹری ملحہ ۔ شعبہ اردو ڈیپارٹمنٹ ۵ الحاج مولوی عبدالحق صاحب
۶ حضرت قمر بھدوری

پروفیسر صفدر حسین ایم اے، ایل، ٹی
گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس

ہندوستان کی تلمیحات

اردو زبان ادبی اور غیر ادبی تلمیحات سے مالا مال ہے۔ اگر ان تلمیحات کو جو ہماری نظم و نثر میں مستعمل ہیں اور جو عام بول چال میں رائج ہیں۔ ایک جگہ جمع کر دیں اور ان پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں میں تلمیحات کی یہ کثرت ہے کہ ان کے لئے فرہنگیں لکھی جاتی ہیں جن میں ان تمام تلمیحات کی تشریح کی جاتی ہے۔ یورپ کی زبانوں میں عام طور پر یونانی، رومن، اینگلو سیکسن اور نارس دیومالا سے تلمیحات لی گئی ہیں اور وہاں کے انشار پرداز اور شاعر ان کو استعمال کرتے آئے ہیں عیسائیوں نے کبھی خیال نہیں کیا کہ اس غیر عیسائی ادب سے یہ تلمیحات کیوں لے جائیں۔ مگر انھوں نے ان سے کافی استفادہ حاصل کیا۔ اس کے برخلاف اردو زبان کے ادیب و شاعر عربی، ایرانی اور ترکی ادب سے ہی متاثر ہوئے اور انہیں ملکوں کے خواب دیکھتے رہے۔ ہندوستان ان کے ادب پر کوئی نمایاں اثر نہ ڈال سکا۔ ہمارے انشا پرداز اور شاعر یہاں کی کسی زبان کی ادبی تلمیحوں سے متاثر ہوئے اور نہ ان کو کبھی استعمال کیا۔ اس قدامت پسندی سے زبان میں وسعت پیدا نہ ہو سکی۔

اگر ہم کسی جرمن فرانسیسی یا انگریزی زبان کا لغات کھول کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے تمام دنیا کی زبانوں اور ادبیات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کوئی کتاب کوئی زبان کوئی قوم کوئی ملک ایسا نہیں ملے گا جس کے عقائد، رسوم، اوہام تاریخ اور ادب کے متعلق ضروری الفاظ ان ترقی یافتہ زبانوں میں موجود نہ ہوں۔ انہوں نے اپنی زبان کو ایک عالمگیر ادب بنا لیا۔ اردو زبان کے انشار پرداز اور شاعر ہندوستان کی زبانوں اور ان کے ادبیات سے گریز کرتے رہے۔ ہندوستان کی کوئی شے، کوئی واقعہ یا کوئی شخصیت ان کو متاثر نہ کر سکی۔ ایک بلند پہاڑ کو کوہ قاف، کوہ الوند سے ملا دیا۔ ہندوستان کا ہمالیہ ان کے پاس کوئی چیز نہ تھا۔ ایک بڑے دریا کو جیحون، سیحون فرات اور دجلہ سے تشبیہ دی حالانکہ ہندوستان میں گنگا، جمنا، سندھ وغیرہ موجود ہیں۔ معاملات حسن و عشق لیلیٰ مجنوں شیریں فرہاد اور وامق عذرا پر ختم ہو گئے۔ ہندوستان کے نل دمن، رادھا کرشن، شکنتلا، دوشیانت ان کے تخیل سے باہر رہے۔ بہادری کے میدان میں رستم و سہراب کے ہندوستان کے سورما بھیم اور ارجن ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ہندوستان کے فطری مناظر ان کو فریفتہ نہ کر سکے عرب، ایران اور ترکستان کے فطری مناظر، موسمی کیفیات نباتات و حیوانات، تاریخی واقعات اور رسم و رواج ان کے ادب کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اردو زبان کے ادیبوں نے ہندوستان کی زبان اور ان کے ادبیات سے استفادہ حاصل

نہیں کیا۔

ہمارے ادب میں ہندو قوم کی ادبیات کا کوئی نشان نہ نثر میں ہے اور نہ نظم میں۔ اس موقع پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ہندوؤں کے مذہبی عقائد، دیوتاؤں کے قصے ان کے شگون، ان کے اوہام، ان کی تاریخ کی غیر معتبر کہانیاں اس قابل نہیں کہ ہم ان کو تسلیم کرلیں۔ ہمارے ادب میں سیکڑوں چیزیں ایسی پائی جاتی ہیں جنکو عقل تسلیم نہیں کرتی۔ اگر ان سب کو ہم اپنے ادب سے خارج کردیں تو زبان کا کیا حال ہوگا۔ اگر ہم ہندو ادبیات سے تلمیحات لیں تو یہ الزام دور ہو جائے گا کہ ہم مذہبی تعصب کی بنا پر ہندو ادبیات سے گریز کرتے ہیں۔ ہندو ہمارے ادبیات سے زیادہ مانوس ہو جائیں گے۔ یہی چیز ہندو مسلمان کے اتحاد کی مضبوط بنیاد ہوگی۔ حب وطن کے میدان میں دونوں قومیں ایک ساتھ دوڑیں گی۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد ہم کو لازم ہے کہ ہندوؤں کے ادبیات کے ذخیرے پر نظر ڈالیں اور ان سے ایسی تلمیحات اخذ کریں جو ہماری اردو زبان کی انشاپردازی میں گھل مل کر اس کے دائرے کو زیادہ وسیع کرسکتے ہیں۔ وید، رامائن، مہابھارت، گیتا، پرانوں، ہندوستان کے تاریخی واقعات، قصوں اور ناٹکوں سے مدد لی جائے۔

مندرجۂ ذیل ہندو ادبیات کی عام تلمیحات کو ہمارے انشاپرداز اور شاعر استعمال کرسکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہماری زبان دونوں قوموں کا مشترک سرمایہ کہلانے کے قابل ہو جائے گی۔ مثلاً کسی وفادار عورت کو ساوتری سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو اپنے شوہر ستیوان پر دل سے فریفتہ تھی اور جب ستیوان کی موت واقع ہوئی تو اس نے فرشتۂ موت "یم" سے التجا کرکے ستیوان کی روح کو قبض کرنے سے باز رکھا اور بھی تلمیحات ذیل میں ملاحظہ ہوں۔

شکنتلا وہ پہلی عورت ہے جو دنیا میں پیدا ہوئی کہتے ہیں کہ برہما نے اپنے جسم سے اس کو بنایا۔ شکنتلا راجہ بھرت کی ماں ہے جس کے نام سے ہندوستان کا نام بھارت ورش ہوا جس کی اولاد مہابھارت کی جنگ میں معرکہ آرا ہوئی۔ شکنتلا رشی وشوامتر اور ایک بہشتی حور مینکا کی لڑکی تھی۔ وہ رشی کنو کے آشرم میں پلی۔ راجہ دوشینت اس پر عاشق ہوا۔ ان کا افسانہ کالیداس کے ناٹک میں موجود ہے ایک رشی کی بددعا سے اس کا شوہر اس کو بھلا دیتا ہے۔ اس کی انگوٹھی جب ایک مچھلی کے پیٹ سے نکلتی ہے تو راجہ پھر شکنتلا کو یاد کرتا ہے۔ بھیم اور ارجن مہابھارت کے ہیرو تھے۔ سدرومن شیوجی کی بددعا سے ایک مہینہ مرد اور ایک مہینہ عورت رہتا تھا۔ اروشی ایک بہشتی حور تھی جس پر راجہ وکرم عاشق ہوگیا۔ چند شرائط پر اروشی وکرم کی رانی بنی سب سے بڑی شرط یہ تھی کہ راجہ اس کے سامنے کبھی برہنہ نہ ہو۔ جب دیوتاؤں نے اروشی کو واپس بلانا چاہا تو اندھیری رات میں بجلی چمکائی۔ اتفاقاً راجہ برہنہ تھا۔ اروشی فوراً اس کی نظروں سے غائب ہوگئی۔

وکرم اروشی کا افسانہ کالیداس نے اپنے ایک ناٹک میں لکھا ہے۔ سورج یا سورج ایک دیوتا ہے جس کی سواری کو سات رنگین گھوڑے کھینچتے ہیں۔ راجپوتانہ کے سورج بنسی راجہ اس کی نسل سے ہیں۔ سوم چاند کو کہتے ہیں وہ بھی ایک دیوتا ہے۔ نباتات کی پرورش کرتا

اس نے ستائیس لڑکیوں سے بیاہ کیا جنہیں نچھتر کہتے ہیں
کام دیو عشق کا دیوتا تیر کمان چلا کر عاشقوں کو گھائل کرتا
ہے۔ بہشتی حوروں اور پریوں کا مالک ہے۔ لچھمی دولت
کی دیوی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی پرستش کی جاتی ہے
رام چندر جی کے زمانے میں اس نے سیتا کا اوتار لیا اور
سری کرشن کے زمانے میں رکمنی کا قالب اختیار کیا۔

سرسوتی علم و فن عقل و دانش اور شعر و شاعری کی دیوی
ہے۔ سفید کنول کو پسند کرتی ہے۔ اگنی آگ کا دیوتا ہے
جس کے سر پر دھوئیں کا تاج ہوتا ہے۔

اندرا آسمان، ہوا، بہشت اور حوروں کا مالک
ہے موسموں کا انتظام اور بارش کا اہتمام اس کے
ہاتھ میں ہے۔ اسی کے حکم سے بادل گرجتے ہیں اور
بجلیاں چمکتی ہیں۔ ایک وقت جب اندرا نے غضبناک
ہو کر طوفان برپا کیا تو سری کرشن، گوبردھن پہاڑ کو انگلی
پہ لے کر کھڑے ہو گئے تو تمام لوگ اس کے نیچے آ کر طوفان
سے بچ گئے۔ مہا دیوی یا پاربتی شیو جی کی بیوی کو کہتے
ہیں۔ مختلف صفات و افعال کی بنا پر اس کے مختلف
نام ہیں۔ غصے کی حالت میں اس کو درگا اور کالی کہتے
ہیں۔ اس وقت اس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے، ہاتھوں
اور دانتوں سے خون ٹپکتا ہے گلے میں سروں اور
کھوپڑیوں کی مالا ہوتی ہے۔ برہما ساری مخلوق کو پیدا
کرنے والا ہے اس کے چار سر ہیں اس کی سواری
ہنس ہے۔ یہ وشنو جی کی ناف سے پیدا ہوا۔ بلرام سری
کرشن کے بھائی تھے۔ یہ گورے تھے مگر سری کرشن
سانولے تھے۔ دونوں وشنو کے اوتار مانے جاتے
ہیں۔ راماین کی مشہور شخصیتوں راجہ دسرتھ، کیکئی

کوشلیا۔ رام چندر لچھمن۔ بھرت۔ سیتا اور ہنومان
کو ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ لنکا کا شہرۂ النفس
راجہ راون تھا جو سیتا جی کو اٹھا لے گیا۔ ہنومان اڑ کر
لنکا پہنچا اور اس ملک میں آگ لگا دی۔ وایو ہوا کا
دیوتا ہے اور اندر کا دوست ہے۔ کورم اوتار کچھوے
کی شکل میں ظاہر ہوا تھا۔ جس کی پیٹھ پر دیوتاؤں نے
بندھیاچل پہاڑ کو رکھ کر شیش ناگ کی رسی بنا کر اور سمندر
کو بلو کر امرت یعنی آب حیات تیار کیا اور اس کو پی کر دیتوں
دشمنوں پر غلبہ پایا۔ رمبھا ایک بہشتی حور تھی۔

سُر بھی ایک اعلیٰ صفت گائے ہے۔ کوبیر خزانوں کا
دیوتا ہے۔ اس کو دھن پتی یا رتن پتی کہتے ہیں۔ ورن
سمندروں کا دیوتا ہے جس کو جل پتی کہتے ہیں۔ مچھلی کے
اوتار کو متسیا کہتے ہیں۔ جب دنیا میں طوفان آیا تو اس مچھلی
کی مدد سے ایک کشتی پر منو اور اس کے ہمراہی محفوظ رہے
پھر منو کی نسل سے دنیا آباد ہوئی اسی اوتار نے ویدوں کو
سمندروں کی تہ سے باہر نکالا تھا۔ راجہ بلی کے زمانے
میں وامن اوتار ظاہر ہوا اور اس نے بلی پر قابو پایا۔

وارہ اوتار نے ہاتھی کی شکل میں ظاہر ہو کر زمین
کو سمندر کی تہ سے باہر نکالا۔ نرسنگھ اوتار شیر کی شکل
میں ایک ستون سے ظاہر ہو کر ایک ظالم راجہ ہرناکشپو
کو پھاڑ ڈالا۔ پرسرام وشنو جی کے چھٹے اوتار اور رام
چندر جی ساتویں اوتار تھے۔ پرسرام نے ایک چھتری
راجہ کو قتل کیا جو کام دھینو گائے کو چرا کر لے گیا تھا۔
سری کرشن بھی ایک اوتار ہیں ان کی ماں دیوکی اور باپ
واسدیو تھے۔ متھرا کا ظالم راجہ کنس دیوکی کے تمام بچوں
کو قتل کرا دیتا تھا۔ سری کرشن کو ایک ٹوکرے میں رکھا گیا

جب ہو کر انھوں نے کنس کو جان سے مار ڈالا۔ کرشن کی آٹھ رانیاں تھیں مگر ان کی محبوبہ رادھا تھی۔ وشنو شیش ناگ کے بستر پر پانی پہ تیرتے ہیں اس لئے ان کا دوسرا نام نارائن ہے۔ ہندوؤں کو تین اوتار کا انتظار ہے۔

شیو جی کو مہادیو بھی کہتے ہیں۔ ان کے پاس تباہ و غارت کرنے والی طاقت ہے۔ یہ بھوتوں کے مالک بھی ہیں۔ بھیشم راجہ شانتنو کا بیٹا تھا اپنے باپ کی شادی ایک حسین ماہی گیر کی لڑکی ستیاوتی سے کرانے کے لئے تخت سے محروم ہوگیا۔

کمبھکرن راون کا بھائی تھا۔ چھ مہینے سوتا اور ایک دن جاگتا تھا۔ شراب کے ہزار گھڑے پیتا تھا اس کو بیدار کرنے کے لئے ڈھول بجائے جاتے تھے۔ شیش ناگ سانپوں کا راجہ ہے۔ پاتال کا ساتواں طبقہ اس کا مقام ہے جب وہ جمائی لیتا ہے تو زلزلہ آتا ہے۔ گنیش دیوتا یا گنپتی ہاتھی کے منہ والا علم و عقل کا دیوتا ہے۔ دروپدی یدھشٹر۔ دریودھن مہابھارت کے مشہور کردار ہیں۔

ہندو ادبیات سے بطور مثال کے جو تلمیحات بیان کی گئی ہیں وہ قابل غور ہیں۔ اس ذخیرے سے ہم کو بہت سی دلچسپ تلمیحات مل سکیں گی۔ ہمارے ادیبوں کو چاہیئے کہ ہندو، سکھ، پارسی، عیسائیوں کے ادبیات سے تلمیحات لیں اور ان کو ہماری انشاپردازی اور شاعری میں استعمال کریں۔ تلمیح کی بنیاد مشہورات پر ہوتی ہے نہ کہ حقائق پر، ان باتوں کا ثبوت عقلاً نہیں دیا جا سکتا۔ سوریہ دیوتا کے رتھ کے آگے جو سات گھوڑے ہوتے ہیں وہ توڑ ڈھکوسلا ہے۔ اصلی بات یہ ہے کہ سورج کی شعاع سات رنگوں سے مرکب ہے۔ یورپ کے سائنس دانوں نے جس حقیقت کا سراغ لگایا تھا ہمارے بزرگوں کی نظر اس پر ہزاروں سال پہلے پڑ چکی تھی۔ امید ہے کہ ہمارے شاعر اور انشاپرداز ہندو ادبیات کی تلمیحات پر غور کریں گے اور اس بیش بہا خزانہ سے استفادہ حاصل کریں گے۔

حبیب اللہ بادشاہ یم،اے،بی،ایل

الجھن

راج قید خانہ کے تاریک حجرے میں بیٹھے ہوئے اپنی داخلی الجھن کو دور کرنے اور ان خوفناک لمحات کو گزارنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس کی پرشور زندگی کے آخری لمحات ہونے والے تھے۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک بے حیا بدچلن جس کو انسان کہنا انسانیت کی توہین ہے اس کے بے رحم پنجے سے دنیا کو آزاد کرنا کس طرح جرم تصور کیا جا سکتا ہے۔ کیا اس بدچلن کی موت سے دنیا کو فائدہ نہیں ہوا؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس پاجی کی موت کی خبر سن کر اکثر کمھلائے ہوئے دل تازہ ہوئے جگدیش کی موت! کیا خوب! نام پاجی تو کیسا نام اس شیطان کو کیا حق تھا ایک فرشتہ کا بہروپ اختیار کر کے انسانوں کو دھوکا دیتا رہے۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک دولت مند تھا اور لوگ دولت سے مرعوب ہو جاتے ہیں، اس میں اور کیا خوبی تھی؟ غرض راج کو کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ اس نے کوئی بڑا گناہ کیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ عدالت کا فیصلہ اس کے خلاف رہا مگر یہ فیصلہ راج کے زعم میں انصاف اور انسانیت کے خلاف فیصلہ تھا۔ اس نے دنیا کو ظالم کے پنجے سے رہائی بخشی۔ آزادی! کتنا دل خوش کن لفظ ہے مگر کیا یہ لفظ شرمندۂ معنی ہو سکا کسی کو اتنی آزادی بھی تو نصیب نہیں کہ دنیا کی بھلائی اپنی چاہت کے مطابق کر سکے غرض اس قسم کی الجھن راج کو بے تاب کر رہی تھی۔ اس کو کامل یقین تھا کہ مقصد کے حصول کے لئے ہر طرح کے ذرائع اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کو احمق سمجھتا تھا جو نیک مقصد کے حصول کے لئے ذرائع بھی نیک ڈھونڈا کرتے ہیں۔ اس کا غصہ شدید ہو کر حقارت آمیز تبسم میں بدل گیا پھر وہ سوچنے لگا کتنے: بااثر لوگ ہمارے ملک میں ہیں جو ہر طرح کے برے کام میں مبتلا رہتے ہیں۔ جب وہ پکڑے جاتے ہیں تو کسی نیک مقصد کی آڑ لے کر بچ جاتے ہیں۔ دنیا کی بڑی بڑی قومیں بھی تو اسی طرح کے خوفناک جرائم میں مبتلا ہیں۔ جب ان کی گرفت ہوتی ہے تو ملکی مفاد کے مقصد کو پیش کر کے آن کی آن میں اپنے گناہ دھو ڈالتے ہیں۔ خوفناک جنگیں ہوتی ہیں، ہزاروں عورتیں اور بچے بے والی اور بے وارث ہو جاتے ہیں مگر حکومتوں کا یہ ادعا ہوتا ہے کہ یہ جنگ صلح عام کے لئے اختیار کی گئی تھی۔ جب دوسرے افراد یا ادارے حصول مقصد کے لئے کسی ذریعہ کو برا نہیں سمجھتے تو پھر راج کیوں مجرم قرار دیا گیا؟

راج نے سیاست کا درس بھی حاصل کیا تھا مگر اس طرح نہیں جس طرح کہ کالجوں میں یا دوسرے

اداروں میں حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کا زاویۂ نظر بھی بالکل الگ تھا۔ وہ سوچا کرتا کیا خدا کے نام کے تحفظ اور مذہب کی ترویج کے لئے خون نہیں بہایا گیا؟ اگر مقدس کام کے لئے خون بہایا جا سکتا ہے اور خدا اس کو برداشت بھی کرتا ہے اور اس کو روکنے کی ذرا بھر کوشش بھی نہیں کرتا تو پھر ایسے خدا کو دور ہی سے سلام کیوں نہ کریں؟

راج کا دماغ ماضی کے صفحات الٹتا ہوا بالکل اس منزل پر پہنچ گیا جبکہ کوئی الجھن درپیش نہیں تھی اس کا بچپن کتنی خاموشی سے گزرا حالانکہ خوشی کے وہ لمحات نصیب نہ تھے جو عام طور پر امیروں کی اولاد کو نصیب ہوتے ہیں۔ اس کو سکھایا گیا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کی اطاعت کرے اپنے پڑوسی کو دوست رکھے اور خدا کی اطاعت میں مصروف رہے۔ غرض وہ جو کچھ بھی دیکھتا تھا اُن ہی دھوکہ باز اور فریب دینے والے شیشوں کے ذریعے دیکھتا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑھتا گیا ویسے ویسے اس پر دنیا کی جعلسازی ظاہر ہونے لگی۔ وہ لوگ اس کو زیادہ گناہ گار نظر آنے لگے۔ جو زیادہ تقوے کی تلقین کیا کرتے۔ بہت سے پنڈتوں کو اس نے پند و نصائح والدین کی اطاعت کا سبق دیتے ہوئے سنا۔ مگر جب ان کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا تو اس کو معلوم ہوا کہ وہ سب سے زیادہ اپنے اپنے والدین کی نافرمان اولاد تھے۔ واعظوں نے اکثر اس سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ خدا کی چاہ میں اپنے دل کو لگائے مگر کیسی محبت اور کیسی چاہت۔ جس خدا نے پے در پے مصیبتوں کے پہاڑ اس کے سر پر توڑے وہ خدا کیسے محبت کا مستحق ہو سکتا ہے جبکہ اس کو خدا کے چاہنے والے سب جو ملے دھوکہ باز معلوم ہوئے۔ پڑوسی سے محبت! یہ بات بھی اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ اگر پڑوسی دغا باز ہو تو کیا وہ محبت کا مستحق ہو سکتا ہے۔؟

راج کا باپ ایک غریب مزدور تھا جو صبح و شام محنت کر کے اپنے گھر کے لئے بمشکل روٹی مہیا کر سکتا تھا۔ وہ ہر طرح کی تکلیف خود برداشت کرتا تھا مگر راج کو کسی طرح کی زحمت ہونے نہ دیتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ خاندان کی تکلیفوں کا دفتر اسی کی ذات سے ختم ہو جائے اور بیٹا ان سے بہت دور رہے۔ اس لئے اس نے بہت کوشش کی کہ راج کو عمدہ سے عمدہ تعلیم دے مگر تعلیم کے لئے بھی تو پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں روٹی کے لئے محتاجی ہو وہاں تعلیم کے لئے روپیہ کہاں سے نکلے۔ راج کے باپ کی بلیغ کوششوں کے باوجود گھر والوں کو کبھی کبھی خالی پیٹ سو جانا پڑتا تھا۔ خیراتی مدرسوں میں راج نے اپنے دن گزارے پیٹھ پر لاتیں ماریں اور پیٹ کی آگ کو کم کرنے کے لئے روٹی کا ٹکڑا پھینک دیں۔ دنیا میں اسی طرح کی خیرات تو بٹتی ہے۔ کون بھوکے کو انسان سمجھ کر کھانا کھلاتا ہے! اکثر تو اس وقت روٹی ملتی ہے جب کہ ایک غریب مزدور سے دو آدمیوں کا کام لے لیا جاتا ہے۔ خیراتی مدرسوں کا بھی حال ہوتا ہے۔ چونکہ ان اداروں کو مدرسوں کا لیبل لگانا ہے۔ برائے نام کچھ تعلیم بھی ہو جاتی ہے۔

راج کا باپ زندگی کی کشاکش کا اول اول تو مقابلہ کرتا رہا مگر سماج کی زنجیروں نے جب اپنی گرفت مضبوط کر دی تو اس کو ہار ماننے ہی بنی۔ اس نے بزدلی کی موت کو بہادری کی زندگی پر ترجیح دی۔ غرض جب اس کا

افسانہ ختم ہوا تو گھر کی ذمہ داری راج پر پڑی۔ اس کو اپنی بوڑھی ماں اور اپنی بہن کو سنبھالنا پڑا۔ باوجود ناتجربہ کاری کے وہ زندگی کے متواج سمندر میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ راج نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ دنیا ایک گھنا جنگل ہے جس میں درخت اپنی جگہ اور اپنا روپ بدلتے رہتے ہیں۔ جس درخت کو سایہ دار سمجھ کر اس کے نیچے آرام کرتا یا اس درخت کے پتے جھڑ جاتے یا وہ درخت اپنے مقام سے کھسک جاتا۔ ان حادثوں سے راج وحشت زدہ ہو گیا۔

وہ پندرہ سال کا ہوا، میٹرکولیشن کلاس میں پڑھنے لگا وہ اپنی پڑھائی ترک کر کے ماں کی خدمت کرنا چاہتا تھا مگر ماں نے اس کو گلے لگایا اور اس کے بوسے لئے۔ دونوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ پھر ماں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا "نہیں بیٹا راج میں اپنے آپ کو سنبھال لوں گی۔ تیری بہن بھی مجھ پر بار نہیں ہے۔ تو اپنی پڑھائی جاری رکھ۔ تیرے مرحوم باپ کی یہ خواہش تھی کہ وہ تجھے دنیا میں ایک بڑا آدمی بنا دے۔ اب وہ نہیں ہے تو اپنے آپ کو بڑا بنا سکتا ہے۔" ماں کی محبت بھرے الفاظ راج کے دل پر بجلی بن کر گرے۔ اس کو اس امر کا پورا اندازہ ہوا کہ ماں کیا ہے۔ اس نے سوچا "صرف ماں ہی محبت کر سکتی ہے اور ماں ہی محبت کے قابل ہے مگر ایسی جبر ماں کی بات نہیں مانی جا سکتی۔ اس کے پاس دولت کہاں ہے جو وہ اپنے آپ کو اور ایک جوان بیٹی کو سنبھال سکے۔"

ماں نے بیٹے کی الجھنوں کو تاڑ لیا اور کہا "بیٹا! تم یہ بھول رہے ہو کہ ایک ہستی نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ وہی ہستی ہماری نگہبانی کرتی ہے۔ بیٹا میں نے بارہا تم سے کہا ہے کہ خدا ایسا رحیم ہے کہ وہ کبھی ہمیں بے دست و پا نہیں کرے گا۔" قید خانہ کی کوٹھڑی میں سوچتے سوچتے راج مسکرانے لگا۔ ماں کی یہ بات اسے بار بار یاد آئی وہ ایک حقارت آمیز مسکراہٹ سے اس خدا کو ادھر ادھر دیکھنے لگا جو غریبوں کا والی اور لاوارثوں کا وارث ہے۔ پھر اس کو اپنی ماں کی سادگی یاد آئی۔ "خدا انسان سے تغافل نہیں کر سکتا؟" اب راج کی مسکراہٹ زبردست قہقہے میں تبدیل ہو گئی۔ قید خانہ کا سنتری راج کے کمرے کے قریب آگیا پھر بھی راج کی ہنسی رک نہ سکی۔ یہ سوچ کر کہ راج شرارت کرتا ہے۔ سنتری نے ڈنڈے رسید کئے مگر راج برابر سوچتا چلا گیا۔

"خدا بندوں سے تغافل نہیں کرتا؟" کیا اس نے مجھے چھوڑ نہیں دیا۔ سادہ لوح ماں اسی عقیدے پر مر مٹی مگر راج کو کبھی اس کا یقین نہ آیا۔ آج ماں زندہ ہوتی تو اپنی آنکھوں دیکھتی خدا کس طرح غریبوں کی بربادی کو ٹھنڈے دل سے دیکھا کرتا ہے۔

راج کی یہ الجھن اور بڑھنے لگی محض اس لئے کہ اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔ وہ اس حد تک اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ اگر خدا نے پیدا کیا ہوتا تو وہ بھی اسی طرح یا اس سے بڑھ کر راج کو چاہتا۔ مگر دنیا میں راج کی طرح کتنے بدنصیب ہیں جن کا کوئی پوچھنے والا نہیں ان پر قیامت ڈھائی جاتی ہے لیکن کوئی ادھر دیکھ نہیں کرتا وہ سردی سے ٹھٹھر جاتے ہیں کوئی انہیں کپڑا نہیں دیتا۔ وہ فاقوں سے مر جاتے ہیں کوئی جو بڑھے ٹکڑے بھی ان کے سامنے نہیں پھینکتا۔ دنیا مردہ کو کفن ضرور

دیتی ہے مگر اس کی وجہ وہ احساس شرمندگی ہے جو دیکھنے والوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ ہر اوارث موہ سماج کے قتاقل کا مجسمہ ہوتا ہے۔ اس لئے سماج جلد سے جلد اس کو زیر خاک کر دیتا ہے تاکہ دل کی وہ نامعلوم بے چینی ختم ہو جائے۔ ان سب باتوں کے خیال سے ماج کر خالق اور خلقت کا نظریہ ایک افسانہ معلوم ہوتا تھا مگر اس افسانہ سے بھی اسے دل کو تشفی نہیں ہوتی تھی۔ اس کا ضمیر اس کی عقل سے بغاوت کر کے اٹھتا تھا "تو زبردست مغالطہ میں مبتلا ہے"

ماج کو اپنی ماں کی متعدد کوششیں ایک ایک کر کے یاد آئیں جن کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم کو جاری رکھ سکا۔ اس نے بی اے کی ڈگری درجۂ اول میں حاصل کی اس کے ایک سونے کا تمغا بھی ملا تھا۔ ان دنوں اس کو بہت کم اپنی ماں کا خیال آتا تھا۔ اس کو یہ اندازہ بھی نہ ہو سکا کہ پیسہ کس طرح سے مہیا کیا جا رہا ہے۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کی ماں اور اس کی بہن دونوں مزدوری کر کر کے اس کے لئے سہولتیں فراہم کر رہی ہیں۔ اس وقت بھی وہ اس خیال سے غافل رہا کہ ایسی محنت مزدوری سے (ان لوگوں کا ناک میں دم آگیا ہوگا۔

ان دنوں اس کی زندگی ایسی غیر ذمہ دارانہ تھی جیسے عام طور پر کالج کے طلبا کی ہوا کرتی ہے۔ اس نے سگریٹ پینا شروع کر دیا، تاش کھلنے میں خاص مہارت پیدا کر لی ہوٹلوں اور کینٹینوں میں اپنا وقت گزارنے لگا۔ بن کے ٹھنے کالج کی ہوسٹلوں کا دلدادہ بھی ہوگیا وہ اپنے کالج میں نہایت ہی مشہور تھا۔ اس لئے کہ نہ تو وہ خشک مقدس تھا نہ رند شاہد باز۔ وہ نیکی اور بدی دونوں کو زندگی کے لوازم سمجھتا تھا۔ بدی سے انحراف کرنا اس کی رائے میں فطرت انسانی سے بغاوت کرنا تھا۔ ہر نیکی میں برائی مضمر ہے اور ہر برائی میں نیکی پنہاں، اسی لئے آدمی نیکی اور بدی کا آمیزہ ہے۔

کالج کے حسین دنوں میں جبکہ وہ ایک ڈنر پارٹی کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ اس کو ماں کی موت کی خبر آئی۔ اس خبر وحشت اثر نے اس کو بت سا بنا دیا۔ مستقبل کی تاریک گھٹاؤں میں وہ کسی چیز کو ڈھونڈنے لگا۔ چہرہ سے حزن اور سنجیدگی ظاہر ہونے لگی۔ اس کے دو چار ساتھی جو اس وقت اس کے ساتھ تھے پریشان سے ہو گئے کہ یکایک اس کی فطرت میں اس بلا کا تغیر کیسے واقع ہوا آدھے گھنٹے کی مسلسل خاموشی کے بعد وہ اپنی جگہ پر سے اٹھا اور خاموشی میں ڈوبا ہوا باہر نکل پڑا۔ جب بہت دور نکل گیا تو بے ساختہ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے: "ناممکن ہے میری ماں مر نہیں سکتی! میں اس سے محبت کرتا ہوں میری پیاری چیز کو کوئی مجھ سے چھین نہیں سکتا" وہ اس انداز میں اپنے آپ گفتگو کرنے لگا کہ راستے کے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ وہ دیوانہ ہے۔ وہ فورا الم سے رونے لگا۔ یہی چیختا جا رہا تھا۔ ماں! تو کہاں ہے ماں؟ اس جذبہ میں وہ اپنے کمرے کو لوٹ آیا۔ بچھونے پر گر پڑا اور چیخ چیخ کر رونے لگا "اے خدا کتنا ظالم ہے تو کہ تو نے میری پیاری ماں کو چھین لیا۔ جواب تو دے۔ کیا اسی لئے لوگ تجھے رحیم کہتے ہیں؟ بہت سے اس کے احباب اس کے اردگرد جمع ہو گئے مگر وہ کسی کو پہچان نہ سکا۔ اسے زرہ گروں کی تلاش نہیں تھی، وہ اپنے غم کا خود ہی اکیلا متحمل ہونا چاہتا تھا۔ بہت دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور احباب

سے گذارش کی کہ اس کو تنہا چھوڑ دیں۔ "کیا تمہاری محبت بھرے الفاظ مجھے اپنی ماں کو واپس دے سکتے ہیں؟ تم بھی میری طرح عاجز ہو۔ تم کیسے اس قدرت بالغہ کا مقابلہ کر سکتے ہو؟ یکایک اس کو خیال آیا۔ آخر میری بدنصیب بہن تو ہے جو اس وقت اس سانحہ سے اثر لیتی ہوگی۔" اس لئے فوراً سفر کی تیاری کی اور جلد سے جلد وہاں پہنچ گیا۔ اس کے جانے تک ماں کی لاش جل چکی تھی اب وہاں راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہ تھا۔ آج پہلی دفعہ اس کو معلوم ہوا کہ کالج کی ساری سہولتیں یہی ماں تو مہیا کرتی تھی جو اب جل کر راکھ ہو گئی ہے۔ وہ اپنی جوانی پر لعنت کرنے لگا کیونکہ یہی جوانی تھی جس نے اس کی آنکھوں پر پردے ڈال دئے تھے۔ وہ بہن کے قریب گیا اور چیخ اٹھا۔ "بہن شانتی میں تمہارے احسانات کبھی نہیں بھول سکتا۔" شانتی نے بھرائی آواز میں کہا۔ "کچھ نہ بولو راج میں نے تمہارے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔" "مجھے اور زیادہ شرمندہ نہ کرو شانتی" راج نے جواب دیا

راج نے محسوس کیا کہ اس کی زندگی اور اس زندگی کی خوشی اس کی اپنی اکلوتی بہن کی زندگی اور خوشی سے وابستہ ہے۔ اب شانتی کو مزدوری کرنے کے لئے کبھی نہ بھیجے گا۔ اس نے سوچا کہ بی۔اے ہو جانا لعنت کا طوق گلے میں ڈالنا ہے۔ نہ وہ مزدوری کر سکتا ہے اور نہ اپنی بہن کو اس کام کے لئے بھیج سکتا ہے۔ موجودہ تعلیم ہماری زندگی میں اسلحۂ جنگ مہیا کرنے کے عوض لڑنے والے کے ہاتھ پاؤں توڑ دیتی ہے۔ ہر معمولی شکل ایک تعلیم یافتہ کے لئے پہاڑ بن جاتی ہے۔ تعلیم کا بس اتنا ہی فائدہ ہوا کہ راج اپنے آپ کو گاؤں کے اجڈ گنوار سے بہتر اور برتر سمجھنے لگا حالانکہ حقیقت کچھ اور تھی۔ تعلیم اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ کسی کی غلامی کر سکے اور غلامی کے بغیر روٹی ملنا محال تھا۔ اس لئے وہ کبھی کبھی اپنی تعلیم اور صلاحیت پر افسوس کرتا اس کو یقین ہو گیا تھا کہ اور سہولتوں کی طرح تعلیم کی سہولت بھی صرف امیروں کے لئے سزاوار ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے ملک اور قوم کی خدمت کر سکتے ہیں، مشہور ہو سکتے ہیں اور نام کما سکتے ہیں مگر ایک غریب . . . . لاکھ تعلیم پانے پر بھی وہ ایک کلرک سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے؟

نوکری اس کی پرچھائیں سے بھی دور بھاگتی تھی اور وہ بھی نوکری سے نفرت کرتا تھا۔ نہ وہ اپنے کسی دوست کے پاس تلاش معاش کے لئے گیا، نہ کسی بڑے آدمی کا سہارا ڈھونڈا۔ اس کے لئے عزت سے مر جانا ذلت کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ وہ اپنی خودداری کو کسی قیمت پر بھی بیچنے کے لئے تیار نہ تھا۔ حالات انسان کے عمل کی تشکیل کرتے ہیں اور راج کے لئے بھی یہی ہوا اس کی اور اس کے بہن کی فاقہ کشی نے اسے مجبور کیا کہ وہ کسی بھلے آدمی سے قرض طلب کرے اور بھلا آدمی بھی کیا اسم بامسمّٰی اس کو ملا۔ شہر میں اور بھی بنئے تھے مگر کوئی بھی جگدیش کی طرح نہ تھا۔ اس نے بغیر ایک کوڑی پائی کے چپے چیبیں ہضم کر سکتے تھے۔ بات چیت میں وہ ملائمت کہ شہد بھی شرما جائے۔ سخاوت کی وہ باتیں کہ حاتم کی آنکھ جل جائے۔ مگر جب سود کا حساب ہوتا تو معلوم ہوتا کہ حضرت گلے دبا رہے ہیں۔ پھر بھی تعجب کی بات یہ ہے کہ لوگ اس سے دلی نفرت رکھتے ہوئے بھی اس کے آگے جھک جاتے

تھے اور بجائے اس کے کہ اس کے سنگین جرائم کا ذکر کریں تعریف کے پل باندھ دیتے تھے۔ اکثر لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ جس عورت کا اس پیسے سے سابقہ ہوا وہ اپنے دامن عصمت کو سلامت نہ رکھ سکی کتنے گھروں کو اس موذی نے برباد کیا اور کتنی جانیں اس کی وجہ سے تباہ ہو گئیں۔

راج نے اول اول گھر کی ٹوٹی پھوٹی چیزیں اس کے پاس گروی رکھیں اور کالج کے دو چار قیمتی سوٹ بھی رہن ہو گئے۔ سونے کا تمغا بھی جگدیش کی نذر ہوا۔ آخر اس کے پاس ان کپڑوں کے سوا جو وہ پہنے ہوئے تھا اور کوئی چیز نہ تھی۔ اس کی بہن انہی دنوں متواتر فاقہ کشی کی وجہ سے بیمار ہو گئی۔ ڈاکٹر نے کچھ انجکشن تجویز کئے مگر اس کے پاس روپیہ کہاں۔ راج حواس کھو بیٹھا۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ اب بہن کی موت اس کی نگاہوں میں کھٹکنے لگی۔ کسی نامعلوم قوی ارادے نے راج کے احساسات کو دھکا دیا اور وہ چونک پڑا۔ "نہیں نہیں" وہ چیخ اٹھا۔ "وہ نہیں مرے گی" راج جگدیش کی کوٹھی پر پہنچا اور قرضہ کا طالب ہوا۔ جگدیش ہنسنے لگا۔ راج کا چہرہ مارے غصہ کے لال ہو گیا پھر بھی اس نے ضبط سے کام لیا۔ اسے بہن کو بہرحال بچانا تھا۔ "جگدیش صاحب آپ کو اس وقت میری مدد کرنی پڑے گی" اس نے عاجزانہ التجا پیش کی۔ "مجھے اپنی بہن کو بہرحال بچانا ہے۔ خدارا ہم پر رحم کیجئے"

"رحم۔۔۔۔؟ میرے نزدیک رحم کردار کا نقص ہوتا ہے۔ خوبی نہیں۔ بیوپار میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں مہربان! میں نے آج تک کسی کو کوئی چیز بلا معاوضہ نہیں دی"

"مگر جگدیش صاحب" راج نے تعجب سے کہا۔ "اس وقت آخر میرے پاس ہے کیا جو میں حاضر کروں"

"ایسی جلدی نہ کیجئے راج صاحب" جگدیش نے کہا "تم نے اپنی ساری چیزیں تھوڑے ہی میرے تحویل کی ہیں؟ تم اپنی بہن کے معالجہ کی فکر کیوں کرتے ہو اگر تم چاہو تو یہ فریضہ میں ادا کروں۔ وہ بھی خوش رہے گی اور تمہیں بھی میں نہال کر دوں گا"

راج کے کانوں پر یہ الفاظ بجلی بن کر گرے۔ سماج کی سختیاں حد سے تجاوز کر چکی تھیں۔ برداشت کا مادہ بالکل سلب ہو چکا تھا اس کا غصہ بے لگام ہوا، اس کا ہاتھ اس کی جیب میں کوئی چیز ٹٹولنے لگا۔

"کیوں راج صاحب" جگدیش نے تقریر جاری رکھی "کیا تمہارے پاس رہن کرنے کے لئے وہ انمول موتی نہیں ہے جس کو تم اپنی بہن کہتے ہو" راج جگدیش کے سینے پر سوار ہو گیا۔ جیب سے نکلا ہوا چھوٹا سا چاقو جگدیش کے سینے کو پھاڑتا ہوا دل کی رگوں تک پہنچ گیا خون اچھل رہا تھا، راج کا چہرہ رنگین ہو گیا۔ اس کو مطلق اندازہ نہ ہوا کہ وہ اس وقت کس سنگین جرم کے ارتکاب میں مبتلا ہے۔ جب جگدیش کے دم توڑنے کی آواز فضا میں پھیلی، ادھر ادھر سے اس کے نوکر دوڑے دوڑے آئے۔ پولیس کو اطلاع ہوئی۔ راج ایک سکتے کے عالم میں لاش کو گھورتا ہوا کھڑے کا کھڑا رہا۔ دو چار آدمیوں نے چپکے سے کہا بھی، کمبخت بھاگ جا۔ مگر اس کی خودداری اس کے دامنگیر ہو گئی۔ آخر پولیس نے اس کو گرفتار کیا۔ وہ جب حوالات میں بھیج دیا گیا تو اس کے ہوش ٹھکانے آئے

اس سے ملنے آیا۔ راج حوالات میں ٹہل رہا تھا اور کچھ بڑبڑا رہا تھا جیسے عام طور پر نیند میں لوگ بڑبڑاتے ہیں۔ لڑکے نے آواز دی۔ "راج بھیا شانتی مرگئی" راج اس خبر سے وحشت زدہ نہیں ہوا۔ اس کو یقین تھا کہ عنقریب وہ بھی اپنی ماں اور بہن سے ملنے والا ہے۔

عدالت میں راج نے کوئی دفاع پیش نہیں کیا اور نہ الزام کی تردید کی۔ ...... یہ بات آسانی سے ثابت ہوگئی کہ راج قتل عمد کا مرتکب ہوا ہے۔ اس لئے عدالت نے پھانسی کی سزا تجویز کی۔

راج نے اپنی زندگی کا جائزہ کامل طور پر لیا ہی تھا کہ جبرہ کا دروازہ کھلا مشکلات ختم ہوئی ہے، سورج کی روشنی آہستہ آہستہ کسی بیکار سرمایہ دار کی طرح دنیا پر اپنا تسلط جارہی ہے۔ راج کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکل پڑا۔ کبھی میں آرام وچین کے لئے اپنی ماں کی محبت بھری باہیں ڈھونڈا کرتا تھا مگر اے پیاری موت تو مجھے اپنی آغوش میں لے لے۔ یہ کہتے ہوئے وہ عملداروں اور کارندوں کے ساتھ چلا۔ سولی کا تختہ سامنے تھا اس نے اردگرد ایک نظر ڈالی اور مسکرانے لگا اور کچھ نہیں نہ ہی ہمیشہ کا آرام تو نصیب ہوا۔ اس کی زندگی کا جہاز تمام کے طوفان خیز سمندر میں اب تک ڈگمگا تا رہا۔ خدا خدا کرکے ٹوٹا تو اس کو سمندر کی گہرائیوں میں پہنچ کر آرام سے سونے کا موقع ملا۔ وہ تختے پر مردانہ وار کھڑا ہوگیا۔ رسی گردن میں پڑگئی۔ تھوڑی دیر بعد تختے پر سے اس کی لاش اتاری گئی تو چہرہ پر سکون کے آثار کے بجائے وہی باغیانہ تیور تھے شاید کہ اس کو موت نے بھی آرام نہیں دیا جیسے اس کی امیدیں اب تک ٹوٹتی رہیں، اس وقت بھی شاید وہی ہوا ہوگا۔ اس کو یہ تلخ اندازہ بھی ہوا ہوگا کہ موت بھی ایسی خوش آئند اور پر سکون نہیں ہے جیسا کہ وہ سمجھ رہا تھا۔

اب جو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

یوسف خاں خواہاں

رازِ ہستی

پردۂ وحدت سے کثرت میں جب آجاتا ہوں میں
حسن بن کر ذرّے ذرّے میں سما جاتا ہوں میں

جوہرِ ذوقِ تجسس کس طرح ہو آشکار
گردشِ ایامِ فطرت سے مٹا جاتا ہوں میں

دیکھ کر اہلِ نظر ہیں دم بخود میرا عروج
سطحِ بینوں کی نگاہوں سے گرا جاتا ہوں میں

مجھ میں پوشیدہ ہیں نقاشِ ازل کی عظمتیں
گلشنِ ہستی کی بو بن کر اڑا جاتا ہوں میں

کیوں نہ للکاروں تری غیرت کو اے بندہ نواز
تیرے ہوتے غیر کے آگے جھکا جاتا ہوں میں

پوچھئے خواہاں نہ اس راہِ طلب کی سختیاں
یہ وہ منزل ہے جہاں پر لڑکھڑا جاتا ہوں میں

الحاج اے جے، جلال الدین بی ٹی اے۔

انسان اور آرزو

انسانی دل و دماغ کے ساتھ جو چیزیں وابستہ ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ کیف انگیز آرزو ہے (آرزو یا تمنا)۔ بنیادی طور پر ایک ہی رجحان قلبی کے مختلف نام ہیں۔ زمانۂ دراز سے انسان کے مختلف اور متضاد افعال کا سرمایہ یہی آرزو ہے۔ محیر العقول کرشمہ ہے کہ یہی آرزو کسی کی خوشی کا باعث ہوتی ہے تو کسی کی موت کا سامان فراہم کرتی ہے۔ کسی کو دوام بخشتی ہے تو کسی کو نیستی کے سمندر میں جھونک دیتی ہے۔ یہ سرمایہ ایسا مضبوط اور مستحکم رہا ہے کہ سمند انقلاب کی تیز گامی کے باوجود عرصۂ آرزو میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ کسی نے آرزو کی دنیا آباد کی تو کوئی خواہشوں کی بے رحم آگ میں جلتا رہا۔ انسان کی زندگی میں آرزو نے کیا کیا کرشمے نہیں دکھائے۔ لطف یہ کہ خود انسان ان کرشموں سے کما حقہ واقف نہیں ہے۔ آخر یہ آرزو یا تمنا ہے کیا؟ مختصر الفاظ میں آرزو اس جذبہ کو کہہ سکتے ہیں جس کا آغاز انسان کے ایک چھوٹے سے حصے سے ہوتا ہے جس کو ہم دل کہتے ہیں۔ دل بھی ایک عجیب شئے ہے۔ کہتے ہیں۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

واقعی حیرانی کی بات ہے کہ دل جیسی ناچیز شئے کے ساتھ ایسی ہنگامہ خیز چیزیں وابستہ رہی ہیں جن پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے۔ انسان کی زندگی ایک مےخانہ ہے جہاں دل ساقی ہے اور آرزو شراب۔ دل پلاتا جا رہا ہے اور مے کش انسان پیتا جا رہا ہے۔ دل کا پیمانہ ارمانوں کی شراب سے ہر وقت لبریز رہتا ہے۔ کچھ شرابی اس مے خانہ میں لٹک کے رہ جاتے ہیں اور وہ جو ساقی کے مزاج سے آگاہ ہوتے ہیں گرتے گرتے سنبھل جاتے ہیں۔ جو انسان ہجوم تمنا میں گرفتار ہو جاتا ہے اور ہر تمنا کے لئے بے تاب ہو جاتا ہے وہ اکثر کامیاب نہیں ہوتا۔ غالب کی زبان میں ؎

ہجوم تمنا سے ناچار ہیں ہم

کی سی حالت اس پر طاری ہو جاتی ہے۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو صاحب دل ہوتے ہیں۔ جو دل کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں۔ ایسے انسان کے دل پہ دماغ حاوی رہتا ہے۔ وہ دل کو ادھر ادھر بھٹکنے نہیں دیتا اس لئے کسی نے کہا ہے

کہ دل را بہر قافلہ راہزن،
دل سادہ کرکی دوست مکن

اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ انسان بے دل ہی

کسی قسم کی آرزو کو جگہ نہ دے بلکہ اقبال کا قول ہے۔

جہاں زندگی ہے وہاں آرزو ہے
جہاں آرزو ہے وہاں جستجو ہے
نہ ہو جستجو تو ہے ویرانہ عالم
تری جستجو ہی تری آبرو ہے

انسان کو اس امر پر فخر کرنا چاہئے کہ اس کی طبیعت میں مادۂ دریافت ودیعت ہو چکا ہے۔ اس دریافت کی بنا پر اس کی جستجو شروع ہوتی ہے جس کی وجہ سے آرزو کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ اس آرزو کی عدم موجودگی میں انسان کی زندگی جمود کی حامل ہوتی ہے اس وقت وہ بالکل ساکن ہو جاتا ہے۔ نہ کوئی ولولہ رہتا ہے نہ کوئی چہل۔

راہِ طلب میں چاہئے سیماب وار دل
ہے آرزو کی موت سکون و قرار میں

انسان کی فطرت سے یہ صاف طور پر عیاں ہے کہ وہ سیماب کی حیثیت رکھتا ہے۔ سیماب کی تقدیر میں سکون نہیں ہے۔ یہ ہر وقت بے قرار رہتا ہے۔ یہ بے قراری انسان کے لئے ضرورت سے خالی نہیں۔ ہر انسان کسی نہ کسی چیز کا خواہاں ہوتا ہے مگر اپنے مقصد کی برآوری کے لئے اس کے دل میں ایک امنگ چاہئے۔ ایک آرزو چاہئے۔ یہ آرزو جستجو کی پیداوار ہے اور انسان کے لئے پیدائشی ہے۔ حالی کی بے قراری یوں ظاہر ہوتی ہے۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

اس شعر میں اقبال کہتے ہیں۔

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہیں ہم
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے دل کو سودا ہے جستجو کا

یہ ناممکن سی بات ہے کہ انسان جمود و سکون کے عالم میں پیدا ہو اس میں گذارا کرے اور آخر مٹ جائے اس متن میں داغ کا شعر بالکل بے معنی ہے۔

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے
دلِ بے مدعا دیا تو نے

درحقیقت انسان کا رجحان جستجو کی طرف ہے اور اس لحاظ سے اس کو موزوں طبیعت عطا ہوئی ہے انسان اپنی تمناؤں کی محفل کو آراستہ و پیراستہ رکھنا پسند کرتا ہے۔ اس کو ہر وقت خوب سے خوب تر کی تلاش لگی رہتی ہے۔ اور وہ اپنی جستجو میں ہار ماننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے!

تمناؤں کی تاریخ کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی ابتدا خدا کی جانب سے ہوئی۔ کائنات کی نمود سے لے کر آج تک تمناؤں کا چراغ روشن ہے۔ خدا نے جب ساری کائنات پیدا کی تو اس کی یہ تمنا تھی کہ یہ دنیا کچھ خاص اصولوں پر گامزن ہو کر اس کے پسندیدہ ماحول کو آباد کرے۔ جب کیفیات سے مبرا ذات احدیت بھی تمنا سے اپنے دامن کو بچا نہ سکی تو انسان کب تمنا سے آزاد ہو سکتا ہے۔ ہر حاکم زماں نے اپنے دور میں چاہا کہ وہ اپنی سلطنت کا سکہ چاروں طرف بٹھائے۔ سکندر کی تمنا تھی کہ وہ پوری دنیا پر فتح پائے۔ منصور کی تلاش حق کی ایسی دھن رہی کہ وہ اسی کی خاطر

جان دے کر رہا۔

پیغمبر اسلام کو یہ جستجو تھی کہ وہ کسی طرح خدا کی وحدانیت اور اس کے پیغام کو دنیا والوں میں عام کر دیں۔ کچھ شعراء جیسے اقبالؔ، حالیؔ، وغیرہ رفاہِ عام اور انسانی ارتقاء کے متلاشی ہوئے۔ گاندھی جی نے قوم کی آزادی کے لئے لڑتے لڑتے جان دی۔ پنڈت نہرو اس فکر میں مبتلا ہیں کہ حکومت عدل و انصاف پر مبنی ہو۔ الغرض کسی کو دین کی دُھن ہوتی ہے تو کسی کو دنیا کی۔ کوئی خود غرضی کی خاطر پریشان ہے تو کوئی دوسروں کے لئے ہر قربانی کو چھوٹی سمجھتا ہے۔

تمناؤں میں اس وقت کھوٹ آجاتی ہے جب ان میں خلوص کی بجائے خود غرضی پائی جائے۔ اسی سے انسان کی روح مردہ ہو جاتی ہے اور وہ حقیقی معنوں میں لٹ کر رہ جاتا ہے۔ یہی تمنا حسد کی آگ جلاتی ہے اور اس طرح کا انسان اپنے ساتھ دوسروں کا نقصان کرتا ہے۔ نمرود کو خدائی پر فخر تھا اور وہ اسی میں تاراج ہوا۔ شداد نے اپنی تمناؤں کی جنت تعمیر کرنے میں کتنے ہی ظلم ڈھائے۔ مگر اس کو اس جنت کی ایک جھلک بھی نصیب نہ ہوئی۔ دنیا اس قسم کی مثالوں سے خالی نہیں ہے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے نامراد انسان بھی اس دنیا سے گزرے ہیں جو تمناؤں سے ہم کنار رہتے مگر اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر تمنا کے لئے بیتاب تھے اور ہر شکست پر دل برداشتہ ہو کر مایوسی کی عمیق چاہ میں روپوش ہو جاتے تھے

مایوسیاں جب حد سے بڑھ جاتی ہیں تو ساری امیدیں ختم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اب دل کا ٹمٹماتا ہوا چراغ صرف ایک امید سے شعلہ فگن رہتا ہے۔ وہ ہے موت کی امید۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے۔ (غالبؔ)

مگر اس امید کے بار آور ہونے کے لئے بھی ایک مدت چاہیئے۔

قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

دنیا میں وہی انسان کامیاب ہوتے ہیں جو آرزو کے گلشن میں شکستِ آرزو کے خارزار کو بھی جگہ دیتے ہیں اور ہر قسم کی ناکامی کے لئے تیار رہتے ہیں۔ دنیا سے توقعات کم رکھتے ہیں اور کسی ناکامی کو غیر معمولی نہیں سمجھتے۔

محی الدین خاں نصیحؔ

التجا

رنج و آلام مرے دل سے مٹا دے ساقی بادۂ عیش و طرب کچھ تو پلا دے ساقی

گر پلانا ہے تو آنکھوں سے پلا دے ساقی جامِ دل کو مرے سرشار بنا دے ساقی

میرے لٹے ہوئے دل کی بھی پریشانی دیکھ پھر سے اجڑی ہوئی دنیا کو بسا دے ساقی

میں بہت دیکھ چکا شعبدۂ عقل و خرد نغمۂ ہوش رُبا کوئی سنا دے ساقی

میری دنیائے محبت میں اجالا کر دے اک تجلی رخِ انور کی دکھا دے ساقی

اب تو جینے سے ہے بیزار نصیحؔ خستہ
اک نئی زیست کا پیغام سنا دے ساقی

پروفیسر حیدر علی خاں حیدر

مشاعرے اور ان کی اِفادیت

اردو کے خزاں دیدہ گلشن کے لئے نوید بہار یہی مشاعرے ہیں۔ ان کی ہمہ گیر مقبولیت دردمندانِ اردو کے دل میں امید کی ایک ہلکی سی لہر پیدا کردیتی ہے اور انہیں یہ خیال ہوتا ہے کہ جہاں اور سہارے چھوٹ گئے وہاں یہ ایک سہارا تو باقی ہے جس کی دل آویزی سنگدلوں کو بھی موہ لے گی۔ اردو ادب کی شہرت ہمارے ملک میں ان ہی مشاعروں سے ہوئی اور عجب نہیں کہ یہی مشاعرے آڑے وقتوں میں اس کے کام آئیں۔

مشاعرہ بروزن مفاعلہ عربی لفظ ہے۔ اس ترکیب کے الفاظ میں اکثر مقابلہ کی صورت مضمر رہتی ہے۔ مشاعرہ کی رسم اول اول عربوں میں ایام جاہلیت ہی سے شروع ہوگئی تھی۔ میلوں اور تہواروں کے موقع پر شعراء اپنے اپنے شعر سناتے تھے۔ کبھی کبھی یہ ادبی مقابلے اپنی حدوں سے تجاوز کرکے ذاتیات تک پہنچتے اور قبیلوں میں باہمی فساد و تنازع کا باعث ہو جاتے۔ اس لئے ایسے موقعوں پر حَکَم کا ہونا بھی ضروری قرار دیا جانے لگا کہ مشاعرہ کے وقت ناگوار صورت پیدا ہونے نہ پائے۔ اس کے علاوہ ایک قسم کا خاص مشاعرہ بھی ہوتا تھا جس کو مفاخرہ کہتے تھے۔ مفاخرہ کے لئے ہر قبیلہ اپنے شاعر کو پیش کرتا۔ وہ شاعر اپنے قبیلے کی بزرگی، سخاوت، ہمت اور شجاعت کا ذکر کرتا۔ اس وجہ سے بھی دلوں کی کدورتیں بڑھ جاتی تھیں اسی مقابلہ اور برتری حاصل کرنے کے خیال نے عربی شاعری کو بہت فروغ دیا۔ اور اسی وجہ سے سبعہ معلقہ جیسے امر قصیدے وجود میں آئے۔

اسی شاعری کا سرمایہ ایرانی نزاکتوں اور نازک خیالیوں کے ساتھ جب اردو ادب کو ملا تو اردو زبان بھی ان ہی روایات کی وارث بنی اور جس وقت سے اردو کی شاعری کی ابتدا ہوئی اسی وقت سے شعراء کی تعلّی کا بازار بھی گرم ہوگیا۔ یہاں تک کہ محمد قلی قطب شاہ جو اردو ادب کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے اسی طرح کی تعلّی میں گرفتار نظر آتا ہے۔ اسی مفاخرہ نے شعراء کو ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے پر آمادہ کیا۔ ہر دور میں کچھ ایسے شعراء ضرور نظر آتے ہیں جو ایک دوسرے کے حریف رہے ہیں۔ سودا گو میر کی شاعری کے معترف تھے پھر بھی انہیں اپنے درجہ کا شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ کسی موقع پر میر کی استادی کو تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی کہہ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

اور جب مقابلہ کی سوجھتی ہے تو کہتے ہیں۔

سودا پڑھیو یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے،
وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ انداز کیا جانے!

میر صاحب سودا کے متعلق کہتے ہیں کہ سودا کبھی کبھی میر مقابلہ کی جرأت کرتا ہے مگر وہ یہ سب کچھ اپنی نادانی کی وجہ سے کر بیٹھتا ہے۔

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
یونہی سودا کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے!

خواجہ میر درد جیسے شاعر کو میر نے آدھا شاعر اور سوز کو پاؤ شاعر کہا۔ البتہ سودا کو وہ کبھی کبھی پورا شاعر بھی کہہ لیتے تھے۔ کسی موقع پر کہا کہ "ریختہ کے صرف ڈھائی شاعر ہیں۔ میں اور سودا اور۔ خواجہ میر درد آدھا" جب کسی نے میر سوز کی یاد دلائی تو کہا "تب تو پونے تین شاعر ہوئے" جب دلی والوں کے متعلق ان کی یہ رائے تھی تو بھلا لکھنؤ والوں کو وہ کب خاطر میں لانے والے تھے۔ کسی ایک مشاعرہ میں انہوں نے ایک قصیدہ پڑھا جس کا نام اجگر نامہ قرار دیا۔ اس میں اپنے آپ کو اژدھا اور اپنے معاصرین کو چوہے، سانپ، بچھو، کنکھجورا وغیرہ وغیرہ قرار دیا اور یہ دھمکی دی کہ اگر اژدھا دم بھرے تو حشرات الارض فنا ہو جائیں گے۔ اس مشاعرہ میں محمد امان نثار ایک موزوں طبع شاعر بھی شریک تھے۔ انہوں نے فی البدیہہ قطعہ کہا جو میر کے قصیدے کا جواب تھا خصوصاً مقطع نے تو محفل کو گرما دیا۔ وہ مقطع یہ ہے

حیدر کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار
ایک چیونٹی میں دو کروں اژدر کے کلے چیر کر

اسی طرح میر سودا اور ان کے معاصرین کے بعد جب، انشا اور مصحفی کا دور شروع ہوتا ہے تو پھر تعلی کا بازار گرم ہوتا ہے۔ انشا فرماتے ہیں۔

بولے ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں
بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

اس کے جواب میں مصحفی فرماتے ہیں

باندھے ہوئے ہاتھوں کو بامید اجابت
رہتے ہیں کھڑے سیکڑوں مضموں مرے آگے

ناسخ اور آتش کی معرکہ آرائی نے بھی یہی رنگ اختیار کیا۔ دلی میں بار دیگر جو شاعری کا بازار گرم ہوا تو ہم غالب اور ذوق میں چشمک دیکھتے ہیں۔ غرض ہر دور میں شاعرانہ تعلی اور سخن گسترانہ باتیں نظر آتی ہیں

ان مقابلوں کا ایک افادی پہلو یہ ہے کہ حریف سے زک اٹھانے کے خوف نے ان شاعروں کو ضرورت سے زیادہ محتاط بنا دیا تھا۔ اس احتیاط کا زبان کی ترقی پر نہایت ہی خوشگوار اثر پڑا۔ الفاظ کا تلفظ، روزمرہ اور محاورہ کا مناسب استعمال، تذکیر و تانیث کے قاعدے، تشبیہوں کی مناسبت، بحروں کے اوزان، غرض کسی ادبی شعبے میں بے قاعدگی آ چکی۔ جہاں کسی شاعر نے بے راہ روی اختیار کی یا غلط ہر مروجہ اور مسلّم قاعدوں سے ہٹا ہوا نظر آیا تو فوراً اعتراض ہوا یا شاعر کو ثابت کرنا پڑتا تھا کہ جو کچھ کہا گیا وہ اساتذۂ سخن کے یہاں جائز ہے یا اسے اپنی ہار ماننے کے کوئی چارہ نہ تھا۔

شاہ حاتم کا واقعہ مصنف آبِ حیات، سعادت یار خاں رنگین کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ جب رنگین شاہ صاحب کی قیام گاہ پہنچے تو وہاں شعر گوئی کی محفل بھی

ہوئی تھی۔ شاہ صاحب نے اپنا ایک تازہ مطلع سنایا۔

سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے
رات ہم ہجر کی دولت کا مزا لوٹا ہے

رنگین بلا کے تیز تھے۔ حالانکہ وہ شاہ حاتم کے شاگرد اور اس زمانہ کی طرز معاشرہ کے مطابق خطائے بزرگاں گرفتن خطا است کے قائل تھے مگر طبیعت کی تیزی نے چپکا بیٹھنے نہ دیا۔ فوراً کہہ اٹھے کہ اگر یہ مطلع یوں ہوتا۔

سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے
ہم نے شب ہجر کی دولت کا مزا لوٹا ہے

تو زیادہ مرغوب ہوتا۔ ایک کمسن شاعر سے استاد کے کلام کی اصلاح ہوتے دیکھ کر ساری محفل چراغ پا ہو گئی۔ مگر واہ رے شاہ صاحب کی بلند حوصلگی میاں رنگین کو گلے لگایا دعائیں دیں اور شعر کو اسی طرح بدل دیا جس طرح کہ رنگین نے بتایا تھا۔ واضح ہو کہ اس زمانے میں لفظ "نے" ضرورتِ شعر کے لئے گرا دیا جا سکتا تھا۔ البتہ اس طرح کے شعر کو غیر فصیح سمجھتے تھے۔ اس لئے شاہ صاحب کا مطلع غلط نہیں بلکہ غیر فصیح تھا اور رنگین کی اصلاح نے اس کو اور بلند کر دیا۔

سید انشاء کی جوانی کا زمانہ تھا دلی میں رہا کرتے تھے اور مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور شعر سنایا کرتے تھے۔ ان دنوں مرزا عظیم بیگ کو نہ صرف دعوائے شاعری بلکہ دعوائے استادی بھی تھا۔ ایک وقت وہ انشاء کے والد سے ملنے آئے۔ اپنی غزل سنائی۔ انشاء بھی وہاں موجود تھے۔ اپنے بزرگ آشناؤں سے تاڑ گئے کہ غزل تو بحرِ رجز میں شروع ہوئی مگر آخر کے کچھ اشعار بحرِ رمل میں جا پڑے ہیں۔ وہ چاہتے تو وہیں مرزا صاحب کی خبر لیتے مگر انہوں نے یہ کام مشاعرہ ہی کے لئے اٹھا رکھا۔ غزل کی بڑی تعریف کی اور تکرار کہا کہ مشاعرہ میں ضرور سنائیے۔ غرض جب اس مدعی کمال نے یہ غزل مشاعرہ میں پڑھی تو انشاء نے فوراً تقطیع کی فرمائش کی۔ مرزا عظیم بیگ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ محفل مشاعرہ کو کلام کے سقم سے آگاہ ہوئی۔ انشاء نے فوراً ایک مخمس پڑھا جس کا مطلع تھا۔

گر تو مشاعرہ میں صبا آج کل چلے
کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے
پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحرِ رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے

عظیم بیگ کو بہت خفت ہوئی۔ انہوں نے اسی طرح پر ایک مخمس کہا اور جلے دل کے پھپھولے پھوڑے اس میں ایک بند ایسا ہے جس میں بطریق احسن ہی مگر اعترافِ شکست کرنا ہی پڑا۔ وہ بند ملاحظہ ہو۔

موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق
تبدیل بحر سے ہوئے بحر خوشی میں غرق
روشن ہے مثل مہر یہ از غرب تا بہ شرق
شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

اور اس کے بعد اس [illegible] سے مرعوب ہوئے کہ جب تک [illegible] قاسم کے پیچھے [illegible]

اپنا کلام دوسروں کے سامنے اس وقت تک مشاعرہ میں دیکھتے کسی کے کلام پر جا کر اعتراض کرنا اس حد تک روا سمجھا جاتا تھا کہ زبان کے مسلّم استادانِ فن پر بھی اعتراض کر بیٹھتے تھے۔ ایک وقت میر تقی میر نے اپنا مطلع سنایا

ابر اٹھا تھا کعبے سے اور جھوم پڑا میخانہ پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے گا شیشہ اور پیمانہ پر

کسی شخص نے کہا کہ حضرت اصل محاورہ فارسی کا اہلِ زبان نے ابرِ قبلہ کہا ہے۔ ابرِ کعبہ نہیں کہا۔ میر صاحب نے کہا "ہاں قبلہ کا لفظ بھی آسکتا ہے۔ مگر کعبہ سے ذرا مصرعہ کی ترکیب گرم ہو جاتی ہے" غرض شعرا کے کلام پر اعتراض اور شاعر کی طرف سے اس کا جواب مشاعرہ کی گویا روایت بن چکا تھا مگر اعتراض کا معقول ہونا اور توجہ کے قابل ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا ورنہ اعتراض کرنے والے کو خفت اٹھانی پڑتی تھی۔ غرض اعتراض اور اس کے جواب ہر دو میں ایک جاہلانہ رنگ پایا جاتا تھا۔ ادبی ہنگاموں کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو بہتوں زمانہ انشا اور مصحفی اور تاسخ و خواجہ حیدر علی آتش کا ہے۔ قارئین کی تفریحِ طبع کے لئے ذیل میں انشا اور مصحفی کے ایک ادبی ہنگامے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ایک مشاعرہ کی طرح کے قوافی اور ردیف تھی کہ انگور کی گردن وغیرہ۔ مصحفی نے ۲۸ شعر کی ایک غزل کہی جس کے کچھ شعر درج ذیل ہیں۔

سرکشی ہے تیرا جو انگور کی گردن
نے مرے بھی ایسے شیرہ حور کی گردن
مچھلی نہیں ساعد میں ترے بلکہ نہاں ہے
وہ ماہ میں ماہیِ سقنقور کی گردن
دل کیوں کہ پری حور کا پھر اس سے نہ بہلے
صانع نے بنائی تری بلّور کی گردن
یوں زلف کے حلقہ میں پھنسا مصحفی والے
جوں طوق میں ہووے کسی مجبور کی گردن

انشا نے بھی ان قافیوں میں شعر نکالے جن میں درپردہ مصحفی پر چوٹ تھی۔

توڑ دونگا خمِ بادۂ انگور کی گردن،
رکھ دونگا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن
اچھلی ہوئی ورزش سے تری ڈنڈ پہ مچھلی
ہے نامِ خدا جیسے سقنقور کی گردن
بھینچے ہے بغل اپنی میں اس زور سے جو عشق
تو توڑنے پہ ہے کسی مجبور کی گردن

مقطع میں تو انشا نے مصحفی کی طرف کھلے الفاظ میں اشارہ کیا۔

حاسد تو ہے کیا چیز کرے قصد جو انشا
تو توڑ دے جھٹ بلبلِ باعور کی گردن

بلبلِ باعور کے لفظ میں مصحفی کے بڑھاپے کی طرف صاف اشارہ تھا۔ اس پر ہی انشا نے اکتفا نہیں کیا فوراً ایک قطعہ بھی کہا جس میں بیشتر پر صاف الفاظ میں اعتراضات تھے۔ کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

سُن لیجے گوشِ دل سے مرے مشفقا یہ عرض
مانندِ بید غصّے سے مت تھرتھرائیے
کیا لطف ہے کہ گردن کا ڈور باندھ کر
مُردے کی باس زندے کو لا کر سنگھائیے

ایسے بجس کثیف قوافی سے بزم میں
دندانِ ریختہ پہ پھپوندی جمائیے
گردن کا دخل کیا ہے سقنقور میں بھلا
ساٹھے کی طرح آپ نہ گردن ہلائیے
مشفق کڑی کمان کو کڑاڑی نہ بولئے
جلا کے منھ سے تیرِ ملامت نہ کھائیے

۱۔ دندانِ ریختہ پہ پھپوندی جمانا اشارہ ہے مصحفی کے ہلتے ہوئے دانتوں کی طرف جن پر مسّی ملی ہوتی تھی۔

۲۔ سقنقور ایک آبی جانور ہے۔ انشا ماہی کا لفظ گرا کر مصحفی کے کلام پر اصلاح دے رہے ہیں۔

۳۔ مصحفی نے ماہیٔ سقنقور میں 'ی' اور بلور کی گردن میں 'ل' کو مشدد کیا ہے۔ انشا کہتے ہیں کہ جب ماہیٔ سقنقور میں 'ی' اور بلور میں 'ل' مشدد ہو سکتے ہیں تو کڑی میں 'ڑ' کو مشدد کر کے کڑاڑی کیوں نہ کہیں اس موقع پر مصحفی نے بھی اپنی استادی کے جوہر دکھائے۔ جورہ مستزاد کے قوافی اور گردن کی ردیف ہی میں انہوں نے اپنا قطعہ پیش کیا

اے ناکسِ معارض ہو مری تیغِ زباں سے
تو نے سپرِ عذر میں معذور کی گردن
کافور سے مطلب ہے مرا اس کی سفیدی
ٹھنڈی تو ہے اصلا ہی نہیں کافور کی گردن
یہ لفظ مشدد بھی درست آیا ہے مجھ سے
غم ہوتی ہے کوئی مری بلور کی گردن

یہ ایک بڑا قطعہ ہے مگر مصحفی کی تیغِ زباں کے جوہر دکھانے کے لئے یہ اشعار ہی کافی ہیں۔

ان معرکوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شاعر کے لئے حاضر جواب ہونا اور موزوں طبیعت رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جب ہی اس کا کمال واضح ہوتا ہے اور وہ سرخ روئی کے ساتھ محفل مشاعرہ سے اٹھ سکتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے اپنے بہترین مضمون دلی کے یادگار مشاعرہ میں قلعہ کے ایک شاعر حافظ عبدالرحمٰن احسان کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ انہیں مصرعہ پر مصرعہ لگانے میں کمال تھا اور سند ایسی فراغ سے دیتے تھے کہ معترض منہ دیکھتا رہ جاتے تھے۔ وہ شاہ عالم بادشاہ کے استاد تھے ایک وقت بادشاہ نے مصرعہ کہا ؎

صبح بھی ہوسے تو دیتا مجھے اے ماہ نہیں

احسان نے فوراً مصرعہ لگایا۔

نامناسب ہے یہاں وقت سحرگاہ نہیں۔

کسی نے وقت سحرگاہ پر اعتراض کیا تو انہوں نے سند میں صائب کا شعر پڑھ دیا۔

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد
خواب در وقت سحرگاہ گراں می گردد

نوابان کرناٹک کے دربار میں بھی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ سامعین کو اعتراض کی عام اجازت تھی۔ بالخصوص غلام غوث خاں المتخلص بہ اعظم کی محفل کا تو رنگ تھا کہ ادھر شاعر نے شعر سنایا اور ادھر ہر طرف سے اعتراضات ہونے لگے۔ اگر شاعر نے اعتراض کا شافی جواب دیا اور معقول سند پیش کی تو نواب صاحب کا حکم ہوتا کہ وہ شعر

خارج از غزل کر دیا جائے۔ واضح ہو کہ طبع نازک اپنے ہی ہاتھوں کا گھونٹنا کام نہیں۔ مگر ادب کی ترقی کے لئے ایسی بھینٹ بھی چڑھانی پڑتی تھی۔

خلاصۂ مقال یہ کہ شاعرہ کی اپنی روایتوں اور اپنی ہنگاموں نے اردو ادب کے معیار کو بڑھایا اور اسے بے راہ روی سے بچایا۔ دنیا کے چھوٹے چھوٹے ملکوں کا یہ حال ہے کہ زبان دس دس کوس پر بدلتی جاتی ہے۔ مگر ہندوستان باوجود ایک برِ صغیر ہونے کے اردو ادب کا رنگ شمال سے جنوب تک یکساں رہا۔ ہر ترمیم و تبدیل اس وقت تک ناقابل برداشت سمجھی جاتی تھی۔ جب تک دلی یا لکھنؤ سے سند دل جائے۔

ان مشقتوں کے بعد شاعر جب کسی معیار پر پہنچتا تھا تو لازمی طور پر وہ اپنی قدر و قیمت سے باخبر ہوتا تھا۔ تحسین ناشناس سے بچتا اور سکوتِ سخن شناس سے ڈرتا تھا۔ حکیم مومن خاں مومن نے کیا خوب کہا ہے۔

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر کچھ
تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

واقعی کسی سخن فہم کا داد دینا ہی شاعر کے لئے کیف انگیز ثابت ہوتا ہے۔ مصحفی کے متعلق یہ مشہور ہے کہ کسی مشاعرہ میں وہ اپنا یہ مطلع پڑھ رہے تھے۔

یاں لعل فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
مصروف ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

تو میر جیسے بے نیاز شاعر بھی متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ ذرا اس شعر کو پڑھنا بقول محمد حسین آزاد ان کا اتنا کہنا ہزار تعریفوں کے برابر تھا۔ شیخ صاحب موصوف اسی قدر الفاظ کو تمغائے کمال کا سمجھ کر [illegible] اللہ کہ سلام کیا اور کہا کہ میں اس شعر کو اپنے دیوان میں ضرور لکھوں گا کہ حضرت نے دوبارہ پڑھوایا تھا۔ قدیم اساتذہ ان لوگوں کو شعر سنانا ہی اپنی توہین سمجھتے تھے جو شعر سمجھ نہ سکیں۔ میر نے اس امر میں اتنی احتیاط کی کہ بے دماغ مشہور ہو گئے۔ ناسخ تو سامع کا باقاعدہ امتحان لیتے تھے کچھ بے معنی اشعار عمداً اس لئے لکھ رکھے تھے کہ سامع کی سخن فہمی کا اندازہ ہو جائے۔ مصنف آب حیات نے اس طرح کے دو شعر نقل کئے ہیں۔

(۱) آدمی مخمل میں دیکھے مورچے بادام میں
ٹوٹی دریا کی کلائی زلف الجھی دام میں
(۲) تو نے ناسخ وہ غزل آج لکھی ہے کہ ہوا
سب کو مشکل ید بیضا میں سخنداں ہونا

شاعروں کے ان ہنگاموں میں یہ صحیح ہے کہ بدمزگیاں پیدا ہو جاتی تھیں۔ اعتراضات ادبی حدود سے بڑھ کر ذاتیات تک پہنچ جاتے تھے۔ مگر اس میں بھی ان کی تیزیِ طبیعت اور حاضر جوابی ظاہر ہوتی تھی ایک وقت ناسخ نے خواجہ آتش پہ چوٹ کی تھی

ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیوان کا جواب
بو مسیلمہ نے لکھا تھا جیسے قرآں کا جواب

تو خواجہ صاحب نے جواب دیا۔

کیوں نہ دے پھر مومن اس ملحد کے دیوان کا جواب
جس نے دیوان اپنا ٹھہرایا ہے قرآں کا جواب

اس طرح کے اور معرکے بیان کرنا مضمون کو

طویل کرنا ہے لہٰذا اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔
یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ راقم الحروف کا یہ منشا نہیں ہے کہ ہمارے آج کل کے مشاعروں میں شعراء اسی طرح ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالا کریں جس طرح کہ اس سے پہلے ہوا کرتا تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ آج بھی شعرا اپنے معیار کا خیال رکھیں۔ سامعین بطریق احسن مناسب اور برموقع اعتراض کریں اور شعرا جواب دینے کے لئے آمادہ رہیں۔
افسوس ہے کہ ہمارے شہر کے مشاعروں کا یہ حال ہے کہ جتنے شعرا ہوتے ہیں اتنے بھی سخن فہم نظر نہیں آتے۔ شاعرانہ لطافتیں اور رمزیہ کیفیتیں فضا میں اس طرح کھو جاتی ہیں جیسے جنگلوں میں پھولوں کی خوشبو۔ البتہ ترنم تھوڑا بہت کام کر جاتا ہے۔ مگر واضح ہو کہ مشاعرہ کے دو عناصر ہوتے ہیں ایک شاعر اور دوسرے سامعین۔ جہاں ادھر شاعر کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے کلام کے معیار کو بڑھائے ادھر سامعین کے لئے بھی ضروری ہے کہ اپنی سخن فہمی کو اعلیٰ درجہ پر پہنچائیں۔ انگریزی ادب کی بلندی کا راز یہی ہے کہ وہی ادب اس ملک میں مشہور ہوتا ہے جس میں کچھ دم ہو۔ اہلِ ملک شاعر اور ناشاعر میں فرق کرنا جانتے ہیں۔ رابرٹ برنس ROBERT BURNS نے اپنی دیہاتی زبان میں بھی ادبی جواہر پارے پیش کئے تو ملک والوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بہت سے شاعر لندن جیسے شہر میں پیدا ہو کر بھی اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے عوام کو متوجہ کر نہ سکے۔

جنابہ الحاجہ ہاجرہ بیگم صاحبہ ایم اے

جوگن کی پکار

بنی پیا کا پیام آئے
دکھی ہیا کو مرے لبھائے

بنی جی۔ من کی پکار مانوں
اور تمہیں پھر سے پھر پا لوں
سب سے رشتہ اپنا توڑوں
ناتا بس اک تم سے جوڑوں
یثرب ہی میں، میں بس جاؤں
پیا سے اپنا من میں لگاؤں
تن من دھن سب تم پہ واروں
پریت کی ریت میں تن سے نبھاؤں
تمہاری جوگن میں بن جاؤں
موہن کے سایہ میں سو جاؤں

لوگ پکاریں آشا آشا
اور مجھے پائیں نہ کسی جا

(۱) دلی

الحاج مولوی مرزا غلام عباس علی عباسؔ

غزل

جب بلبلوں سے گل کی یہی بے رخی رہی　　کیا لطف زندگی میں رہا کیا خوشی رہی
اک روز بات ان سے محض سرسری رہی　　تاثیر اس کی مدتوں دل میں جمی رہی
وہ ہنس رہے تھے آتشِ غم سے تھے ہم کباب　　دل کی لگی اِدھر تو اُدھر دل لگی رہی
کیسا زمانہ آیا کہ ہے قیس بے جنوں　　لیلیٰ کے حسنِ رخ میں نہ کچھ دلبری رہی
آنکھوں سے اشکِ خوں کی تھیں لڑیاں کبھی رواں　　اب نام کو نہ آنکھوں میں باقی تری رہی
گلگشت میں نظر جو کلی پر مری پڑی　　یادِ دہن میں دل کو بہت بے کلی رہی
پارینہ داستانیں ہیں اب حسن و عشق کی　　محدود شاعری میں فقط عاشقی رہی
ہے دل کے آئینہ میں مرے عکسِ روئے یار　　شیشہ میں میرے آکے مقید پری رہی
نادار دارا اور سکندر رہے خالی ہاتھ　　پہنچے جو قبر میں تو نہ شاہنشہی رہی

محفل میں ان کی اب بھی ہے عباسؔ کی طلب
شکر خدا رہی یہی عزت بنی رہی

بوب بادشاہ محبوب

غزل

ہم دردِ محبت کا مداوا نہیں کرتے اب کچھ بھی ہو تقدیر سے کھیلا نہیں کرتے
آنکھوں ہی سے حالِ دلِ مضطر ہے نمایاں ہم ان سے کبھی شرحِ تمنا نہیں کرتے
ہیں نے تو تمہارے لئے دنیا کو بھی چھوڑا اک تم ہو کبھی مجھ پہ بھروسا نہیں کرتے
اے وحشتِ دل تو ہی ذرا دینا گواہی کیا کرتے ہیں ہم انکے لئے کیا نہیں کرتے
یہ پندیہ پندار بجا حضرتِ واعظ کیا آپ خیالِ رخِ زیبا نہیں کرتے؟
زنداں میں زباں بندی، یہ توہینِ جنوں ہے ہم اہلِ محبت یہ گوارا نہیں کرتے

ہم نے ہی یہ اندازِ ستم بخشے ہیں تم کو
اے کاش تمہیں ہم کبھی سجدہ نہیں کرتے!

اے۔ جے۔ اردو سیمنار کا چوتھا سالانہ مشاعرہ

ہنگامہ ہائے شوق ہی کی کرشمہ سازی ہے کہ بزم امکان کا گوشہ گوشہ فردوس گوش اور جنت نگاہ کا سامان مہیا کرتا ہے۔ ان ہی ہنگاموں میں ایک مشاعرہ ہے جو نہ صرف بزم اردو کو سجاتا ہے بلکہ اس کی حیات کا بھی ضامن ہوا ہے۔ اس بیان کا کافی ثبوت اے' جے' اردو سیمنار کے سالانہ مشاعروں سے ملتا ہے۔

چنانچہ اس کا چوتھا سالانہ مشاعرہ بھی ایسا ہی مرغوب عوام رہا جیسے پچھلے مشاعرے۔ اس سال بھی پچھلے سال کی طرح اس کی دو نشستیں بتاریخ ۴ر اور ۵ر فروری ۱۹۵۶ء راجہ اناملے ہال میں منعقد ہوئیں ان دونوں نشستوں کی صدارت تقدس مآب، فضیلت انتساب ڈاکٹر الحاج مولوی عبدالحق صاحب ممبر پبلک سروس کمیشن نے فرمائی۔ مقامی اور ریاستی شعراء کے علاوہ علامہ انور صابری جناب خیر بہوروی' جناب نذیر بنارسی، جناب ڈگمبر پرشاد گوہر دہلوی' جناب قتا نظامی کانپوری، جناب ستیش ساحر گورکھپوری، جناب ضیا فتح آبادی، جناب امیر دہلوی' جناب شاہد صدیقی حیدرآبادی، جناب سلیمان اریب حیدرآبادی، جناب ناوک لکھنوی اور جناب شوق بہرائچی نے شرکت فرمائی۔

اس موقع پر یہ یاد دلا نا بے جا نہ ہوگا کہ [illegible] کے مشاعرہ میں عزت مآب سری ظری پرکاسا گورنر مدراس اس وقت کی دونوں نشستوں میں بحیثیت معزز مہمان شریک مشاعرہ ہوئے اور اپنی گرانمایہ شمولیت سے مشاعرہ کو پر رونق بنایا تھا۔ فی الحال چونکہ وہ بمبئی کے گورنر ہیں اس لئے ہم آپ کی شمولیت سے محروم رہے۔ پھر بھی جناب موصوف نے از روئے اردو دوستی اس مشاعرہ کو اپنے پیام بناعت نظام سے نوازا۔

پہلی نشست

۴ر فروری ۱۹۵۶ء کو شب کے آٹھ بجے سے ہی راجہ اناملے ہال میں لوگ جمع ہونے لگے اور نو بجے تک سارا ہال سامعین سے پُر ہوگیا۔ تقریباً نو بجے مولوی الحاج سید عبدالوہاب صاحب بخاری صدر اے، جے، اردو سیمنار، خطیب عبدالکریم صاحب نائب صدر، اے، جے، جلال الدین صاحب معتمد اور دیگر اراکین صدر مشاعرہ کے استقبال کے لئے ہال کے صدر دروازے کے پاس کھڑے ہوگئے۔ ٹھیک نو بجے ڈاکٹر صاحب قبلہ تشریف فرما ہوئے اور حاضرین سے ملاقات کے بعد صدر سیمنار کے ساتھ ہال کے متصل کمرہ میں داخل ہوئے جہاں شعراء قبل از وقت جمع تھے۔ شعراء سے تعارف اور ملاقات کے بعد آپ ہال میں داخل ہوئے۔ آپ کے ساتھ صدر سیمنار اور شعراء بھی داخل ہوئے۔ جنوز بہ [illegible]

گرا ہوا تھا۔ نگاہ 'راز درونِ پردہ معلوم کرنے کے لئے منتظر تھی۔ ڈائیز پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ اس پر ایک نشستِ خاص صدر کے لئے مقرر تھی۔ صدر سمینار نے صدرِ مشاعرہ کو نشستِ خاص پر جلوہ افروز ہونے کی دعوت دی۔ صدرِ مشاعرہ نے صدرِ سمینار کو بھی اپنے ساتھ بیٹھنے کی درخواست کی۔ غرض یہ دونوں بزرگ نشستِ خاص پر رونق افروز ہوے۔ شعرا ڈائیز کے کنارے ادھر اُدھر بیٹھ گئے۔ پردہ اٹھا۔ معتمد اور نائب معتمد صدرِ مشاعرہ اور صدرِ سمینار کو علی الترتیب پھولوں کے ہار پہنانے کے لئے دوڑے۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ علامہ آذر صابری کو حاضرین اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ اٹھ کر دیکھنے لگے اس لئے کہ علامہ موصوف کامل دو سال بعد پھر مدراس تشریف فرما ہوے تھے۔

الحاج مولوی سید عبدالوہاب صاحب بخاری صدر شعبۂ اردو سمینار مائیک کے پاس تشریف لائے اور اپنی دلآویز تقریر میں شعرائے کرام اور حاضرین کا خیر مقدم فرمایا۔ دورانِ تقریر میں آپ نے اس ادارے کی خوش بختی پر اظہارِ مسرت فرمایا کہ اتنی قلیل مدت میں اس نے شمال اور جنوب میں اپنا خاص مقام پیدا کر لیا ہے۔ اس کی دعوت پر شمال کے مشہور و معروف شعراء تشریف لاتے ہیں۔ فاضل مقرر نے سامعین کو اس امر سے آگاہ فرمایا کہ وہ اشعار کو سمجھ کر داد دیں اور اس میں مقامی اور غیر مقامی کا فرق ملحوظ نہ رکھیں "گو مشاعرہ تفریح کا باعث ہوتا ہے پھر بھی اس کا ایک خاص معیار ہوتا ہے اور اس کا مزاج عام تفریح گاہوں سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ لہٰذا سامعین سے گذارش ہے کہ وہ مشاعرے کے خاص مزاج کو ملحوظ رکھیں اور اس کی کامیابی کے لئے اراکین کے ساتھ پورا تعاون فرمائیں۔" پھر آپ نے ڈاکٹر الحاج مولوی عبدالحق صاحب سے گذارش کی کہ وہ مشاعرے کی کارروائی آغاز فرمائیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے تقریر کی ابتدا میں آل انڈیا ریڈیو مدراس کا شکریہ ادا فرمایا جس کی مہربانی سے مشاعرے کے نشر کا انتظام ہوا۔ پھر آپ نے یہ رائے ظاہر فرمائی کہ مشاعرے پر کافی ریسرچ ہو۔ اس لئے کہ مشاعرے ہر دور میں اپنے اپنے ماحول کا رنگ لئے ہوے ہوتے ہیں۔ گو ہمارے لکھنے والوں نے مشاعروں کا ذکر ادھر اُدھر کیا ہے۔ مگر ان کی ابتدا کی تاریخ اور ان کی ترقی پر کسی نے کافی مواد جمع نہیں کیا۔ آپ نے مشاعرے سے متعلق ارشاد فرمایا کہ اس کے تین عناصر ہوتے ہیں یعنی منتظمین، شعرا اور حاضرین۔ ان تینوں کے تعاون ہی سے مشاعرہ کامیاب ہوتا ہے۔ آپ نے انجمن ترقی اردو دہلی کے ایک مشاعرہ کا ذکر فرمایا جو سنہ ۱۹۴۰ء میں ہوا تھا۔ اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ خود صدرِ مشاعرہ دروازہ پر منہ دیکھتے رہ گئے اندر جانا نصیب نہ ہوا اور مولوی عبدالحق صاحب بابائے اردو اس کے بعد کوئی اور مشاعرہ نہ کر سکے پھر صدرِ موصوف نے شاعری کے محاسن پر روشنی

ڈالی اور فرمایا کہ شعرا دنیائے رنگ و بو کی ساری کیفیتیں الفاظ میں جمع کر لیتے ہیں۔ شاعری مناسب الفاظ میں صوتی کیفیت اور معنوی قدر کی وجہ سے مؤثر ہوتی ہے۔ خیالات کے لحاظ سے ہماری شاعری میں لذت پائی جاتی ہے مگر شاعر محض لذت آفرینی پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ زندگی کے مسائل کو بھی بطریق احسن حل کرتا ہے۔ جہاں وہ دلوں کی دنیا آباد کرتا ہے وہاں انسانی افکار میں ایک ضبط اور ایک نظام پیدا کرتا ہے۔ شاعرے کی تفریحی حیثیت مسلم ہے لیکن تفریح اسی حد تک ضروری ہے جو انسان کو عمل کے لئے تیار کرے۔

پھر آپ نے شعرائے کرام کا حاضرین سے تعارف فرمایا اور ان کا شکریہ بھی ادا فرمایا کہ ان میں سے اکثر حضرات نے طویل سفر برداشت کرنے کے بعد شاعرے میں حصہ لینے کی زحمت گوارا فرمائی۔

صدر موصوف کی تقریر کے بعد ہز ایکسلنسی سری شری پرکاسا سابق گورنر مدراس اور فی الحال گورنر بمبئی کا عطا کردہ پیغام سنایا گیا پھر جناب خیر بہروری نے بہ اجازت صدر بعض مشاہیر ہند کے پیغام سنائے

اب تک سمینار کے شاعروں کی ابتدا مولوی الحاج مرزا غلام عباس علی صاحب عباس کے کلام سے ہوا کی ہے اس لئے صاحب صدر نے مولوی صاحب ہی سے درخواست کی کہ وہ اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمائیں۔ مولوی صاحب موصوف مدراس کے ایک معمر بزرگ ہیں۔ آپ حضرت جلال لکھنوی کے تلامذہ میں سے ہیں۔ زبان اور محاورہ کا آپ کو خاص خیال ہوتا ہے۔ اپنا کلام تحت اللفظ سناتے ہیں پڑھنے کے انداز قدیم اساتذہ کے سے ہیں۔ صدر کی درخواست پر آپ مائیک کے سامنے بیٹھ گئے اور غزل سنانی شروع کی۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

وہ حسن تیرا یہ عشق میرا ہزاروں فتنے بپا کرے گا
اُدھر سے شعلے اٹھا کریں گے ادھر مرا دل جلا کریگا

طلائی کی یہ نزاکتیں ہیں کہ وار پڑتا بھی ہے تو اوچھا
گلے کی کیوں کر رگیں کٹیں گی یہ سر مرا کیا جدا کرے گا

ہیں تلخیاں انتظار کی بھی بھروسا ہے انکے قول پر بھی
یہ موت اور زندگی کا عالم یونہی رہا ہے رہا کریگا

میں کیا ہوں میرے گناہ کتنے تری خدائی کی حد نہیں ہے
یہ گدلا پانی تو چلو بھر ہے کثیف دریا کو کیا کریگا

ہے اپنے عصیاں سے ناامیدی بندھی ہے ڈھارس ترے کرم سے
مجھے قیامت کی ہیں امیدیں جو کچھ کریگا خدا کریگا

تو اوجھل انساں کی آنکھوں سے ہے صنم میں جلوہ ہے تیرا کامل
اسی کو دیکھا کریگا عباس نام تیرا جپا کرے گا۔

آپ کی صحت زبان اور محاورہ بندی کی وجہ سے شمالی ہند کے شعرا بھی لطف اندوز ہوتے رہے۔ آپ نے حاضرین سے مناسب داد حاصل کی اور اپنی جگہ پر تشریف فرما ہوئے۔ پھر صاحب صدر نے ویلور علاقہ مدراس کے شاعر اصغر ویلوری کو اجازت دی کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔ . . . .

. . . .

جناب اصغر ویلوری مدراس یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔ ریلوے کے ملازم ہونے کے باوجود آپ نے شاعری سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔ شعر کبھی ترنم سے

ر کبھی تحت اللفظ سناتے ہیں۔ اس وقت تو آپ
غزل تحت اللفظ میں سُنائی۔

تو موت کو موت مت سمجھ دل ہے موت جینے کا اک بہانہ
یہ زندگی ہے حسین دھوکہ جسے سمجھتے ہیں جاودانہ
اٹھو تو لے کر نئی امنگیں بڑھو تو عزمِ جواں لیے تم
اسی میں مضمر ہے رازِ ہستی اسی میں ہے شانِ خسروانہ
تمہیں خبر بھی ہے خار و خس کی قدم قدم پر الجھنے والو
جہاں بسیرا ہے بجلیوں کا وہاں بنانا ہے آشیانہ

اس وقت مشاعرہ میں ایک گھٹن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ کوئی خاص گرمی نظر نہیں آتی تھی۔ اصغر صاحب کے ایک آدھ شعر پہ یا جناب گوہر یا علامہ انور صابری مکانیکی لہجہ میں واہ کہہ دیتے تھے۔ علامہ موصوف کی 'واہ' کے آخری حصہ کی تمدید کچھ حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ جناب اصغر نے غزل ختم کی تو مزاج شناس صدر نے مدراس کے محبوب شاعر جناب محبوب پاشا محبوب سے غزل سنانے کو کہا۔

جناب محبوب ہنوز جوان اور جواں دل شاعر ہیں۔ شعر میں حسن و عشق کی کیفیتیں بڑی عمدگی سے سموتے ہیں۔ آواز بھی بہت خوب پائی ہے۔ چنانچہ جب آپ کے نام کا اعلان ہوا تو محفل میں تازگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ جناب محبوب مائیک کے سامنے بیٹھ گئے اور اپنی دل آویز آواز میں دھیمے سُروں میں غزل سنانے لگے۔ ایک سماں بندھ گیا۔ مطلع ہی نے محفل کو گرما دیا ہر شعر پر واہ واہ سبحان اللہ کا شور بلند ہونے لگا اور تو اور صدر محترم بھی جھومنے لگے۔ اکثر گوشوں سے دوبارہ ارشاد کی صدا بلند ہوتی رہی لیکن آپ کے فلک علم گوش برابر بے نیازی کا ثبوت دیئے جا رہے تھے اس وقت دوبارہ ارشاد کی آواز فضا میں گھوسی گئی جس کا ہمیں بے حد قلق ہے اس لیے ہم آپکی پوری کی پوری

نظر میں گیسوئے پُرخم نہیں تو کچھ بھی نہیں
جگر میں سوزشِ پیہم نہیں تو کچھ بھی نہیں
جہانِ عشق و محبت کا ہے یہی دستور
مزاجِ دوست جو برہم نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس شعر پہ ہر طرف سے واہ واہ ہونے لگی۔ خیر صاحب جھوم جھوم کر پڑھ رہے تھے:-

"مزاجِ دوست جو برہم نہیں تو کچھ بھی نہیں"

جناب محبوب دوسرے شعر پر پہنچ ہی گئے کہہ رہے ہیں۔

کہاں کا نغمۂ بلبل کہاں کا خندۂ گل
چمن میں گریۂ شبنم نہیں تو کچھ بھی نہیں

انور صابری قبلہ ارشاد فرما رہے ہیں "کیا مصرع کہا ہے"؟ محبوب صاحب دوسرا مصرع سنانے لگے

تمہیں ہو جانِ بہاراں تمہیں ہو روحِ چمن
خبر بھی ہے کہ اگر ہم نہیں تو کچھ بھی نہیں؟

محفل کے ساتھ ساتھ جناب صدر بھی محظوظ ہو رہے ہیں۔ جناب عباس صاحب مدراسی کہہ رہے ہیں "سبحان اللہ کیا زبان ہے" جناب محبوب شعر سنانے لگے

خدا کا ذکر بھی زاہد ہوا کہ وردِ زباں
سرور و کیف کا عالم نہیں تو کچھ بھی نہیں

کبھی وہاں ہے خلوت میں دل کی دھڑکن بھی
کبھی کبھی کوئی ہمدم نہیں تو کچھ بھی نہیں

آپ کے ایک ایک شعر نے محفل کو گرمایا اور خراج تحسین حاصل کیا اب مشاعرہ ہر طرح چمک گیا تھا۔ تالیوں کا شور آہستہ آہستہ ختم ہوا تو جناب صدر نے جناب سبش صاحب ساحر گورکھپوری سے درخواست کی کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔ جناب ساحر نوجوان شاعر ہیں۔ میانہ قد، گندمی رنگ اور نک سک سے درست۔ یہ مائیک کے سامنے تشریف فرما ہوئے اور ترنم میں کلام سنانا شروع کیا۔ آواز بات دار ہے۔ مگر چونکہ آپ کے ترنم میں سوز کی کیفیت ہوتی ہے اس لئے محفل میں وہ ولولہ پیدا نہیں ہو سکا جس کے سزاوار آپ کے اشعار ہیں۔ پہلے تین قطعات سنائے جن میں اہل مدراس اور سرپرستان سیمنار کی مدح تھی۔ آپ بھی وہ قطعات ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) قدرداں اردو کے ہیں پیر و جواں مدراس میں
زندگی کے ملتے ہیں زندہ نشاں مدراس میں
اس کا اب اہل قلم کرنے لگے ہیں اعتراف
ہو رہی ہے خدمت اردو زباں مدراس میں

(۲) کتنی محنت سے بسایا ہے جہان اردو
آکے دیکھے کوئی مدراس میں شان اردو
نام حق پہلے لکھے گا وہ جلی حرفوں میں
جب لکھے گا کوئی تاریخ زبان اردو

نام حق سے مراد صدر محترم علامہ الحاج مولوی عبدالحق صاحب کی ذات گرامی ہے۔ حاضرین نے اس قطعہ کی بہت داد دی۔ تیسرے قطعہ میں معتمد بانی سیمنار کی مساعی جمیلہ کا ذکر تھا۔

(۳) سنورتی ہے عمل ہی سے زمانے میں ہر ایک قسمت
بڑی کوشش بڑی تدبیر سے ملتی ہے یہ دولت
چھڑے گا تذکرہ اردو کا جب بھی بزم اردو میں
سراہی جائے گی ساحر جلال الدین کی محنت

ان قطعات کو سنانے کے بعد ساحر نے اپنی غزل سنائی۔ ذیل میں ناظرین کے ملاحظہ کے لئے یہ غزل درج کی گئی ہے۔

ہوتا ہے محبت میں خود حسن یقیں پہلے
یہ مصلحتِ دل ہے جھکتی ہے جبیں پہلے

جناب خیر صاحب داد دے رہے ہیں پھر ساحر ارشاد فرماتے ہیں۔

آج ان کی نگاہوں کے تیور ہی نرالے ہیں
پہلے نہ کہیں ہم سے اٹھ جائیں کہیں پہلے

خیر صاحب نے داد دی اور شعر دوبارہ پڑھوایا پھر ساحر نے شعر سنایا۔

اس در کی جبیں سائی راس آ گئی سجدوں کو
ورنہ یہی سجدے تھے رسوائے جبیں پہلے
دل ان کی اداؤں کے انداز سمجھتا ہے
تکرار کے پردے میں ہوتی ہے نہیں پہلے
اس کفر کے جلوے نے جھکا دیا ایماں کو
ایسی تو نہ زاہد تھی آرائش دیں پہلے

اس شعر پر انور صابری اور گوہر دہلوی نے بہت داد دی ہے۔ محفل میں بھی ادھر ادھر سے واہ واہ کی صدا بلند ہو رہی ہے۔ ساحر نے اپنا مقطع سنایا۔

اب قید تعین سے آزاد ہوں میں ساحر
ہاں سر کو جھکایا تھا اک بار کہیں پہلے

مقطع واقعی بہت اچھا ہے اور اس کی داد بھی خاصی ملی۔ جناب ساحر نے غزل ختم کی تو جناب صدر نے اعلان فرمایا "جناب ضیا فتح آبادی ہمارے شہر کے نہایت ہی محبوب شاعر ہو گئے ہیں۔ اب وہ کلام سنائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ اس کے بعد بھی ایک درخ اور وہ محفل کو سرفراز کریں گے۔

جناب ضیا فتح آبادی کا کافی تعارف پچھلے شاعروں کی روداد میں ہو چکا ہے۔ اس لئے اس موقع پر آپ کا مزید تعارف تحصیل حاصل ہے۔ صدر کے سامنے جناب ضیا مائیک کے سامنے بیٹھ گئے اور رباعیوں سے اپنے کلام کی ابتدا کی۔ وہ رباعیاں ہدیۂ ناظرین کی جا رہی ہیں۔

(۱) تدبیر کا ہر رنگ نکھارا میں نے
تقدیر کی زلفوں کو سنوارا میں نے
دیر اور حرم سے بچ کے لے جوشِ شباب
خوش ہو کے لیا تیرا سہارا میں نے

اس رباعی پر بہت داد ملی۔ پھر جناب ضیا ارشاد فرمانے لگے۔

(۲) نشہ میں متاعِ ہوش گھولی ہے کبھی
اشکوں سے جبینِ شوق دھولی ہے کبھی
ہر ذرہ میں صد ہزار سورج روشن
اے طالبِ دید آنکھ کھولی ہے کبھی

(۳) کیوں اِ عقدے قیامت کے کبھی کھلتے ہیں
بے سعی و عمل کبھی نہیں کھلتے ہیں !
اٹھتا ہے جہاں حسن کے چہرے سے نقاب
اسرارِ شباب کے وہیں کھلتے ہیں۔

جناب ضیا نے ایک دو رباعیاں ۔۔۔۔۔۔ اور سنا کر اپنی غزل شروع کی۔ غزل چھوٹی بحر میں تھی۔ اشعار کی معنوی حیثیت اور پڑھنے کے انداز سے یہ غزل نہایت ہی پر لطف ثابت ہوئی۔ ارشاد فرمایا ہے۔

مر گیا دل گرفتہ نہ ہوا !
جادۂ غم رہ بقا نہ ہوا !
حسن کی ٹھوکروں میں آ کے رہا !
عشق جیں دل کا آسرا نہ ہوا !
دشت و صحرا تو دشت و صحرا ہیں
کوئی دیوانہ کام کا نہ ہوا
ذرہ خورشید بن گیا لیکن
کوئی خورشید ذرہ سا نہ ہوا
بے خودی بندگی کی ہے تکمیل
وہ خدا کیا جو خود نما نہ ہوا

اس شعر پر بہت داد ملی اور بار بار پڑھوایا گیا۔

دل میں دیتا ہوں داغِ غم کو جگہ
وہ اگر تیرا نقشِ پا نہ ہوا
ہے ضیا وہ جبینِ شوق طلب
جس کا ہر سجدہ آستانہ ہوا۔

مقطع بار بار پڑھوا گیا۔ ہر سمت سے واہ واہ کا شور بلند ہوا۔

ضیا نے غزل ختم کی تو صدرِ محترم نے جناب فنا نظامی کانپوری سے درخواست کی کہ وہ زحمت فرمائیں۔ جناب فنا کا تعارف فرماتے ہوئے جناب صدر نے کہا۔ آپ کا تعارف تحصیل حاصل ہے۔ اس

لیے کہ آپ کے کلام کی شہرت یوپی سے مدراس تک پہنچ چکی ہے"۔ فنا صاحب صدر کے اعلان پر مائیک کے جانب بڑھے۔ صورت سے بڑے وضعدار اور مولویانہ ٹھاٹ کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ نہ صرف ڈاڑھی بلکہ گفتار سے بھی مذہبی رنگ ٹپکتا ہے جناب نے پہلا ہی قطعہ سنایا اس سے پہلے تمہیداً یہ جملہ ارشاد فرمایا۔ "مجھ جیسے شاعر کے لیے یہ موزوں نہیں کہ شراب کا ذکر کروں اس لیے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جس شراب سے لطف اندوز ہوتا ہوں وہ شراب کیا ہے؟

اشک غم بے حساب پیتا ہوں　　تلخیٔ اضطراب پیتا ہوں
میں شرابی نہیں ہوں شاعر ہوں　　اصطلاحاً شراب پیتا ہوں

جناب فنا شعر ترنم میں سناتے ہیں۔ آپ کے ترنم کا ایک خاص رنگ ہے جو نہایت ہی موثر ہے آواز کے زیر و بم کے ساتھ ہاتھ بھی فضا میں ابھرتے اور گرتے نظر آتے ہیں۔ غرض ان محرکات نے اس قطعہ کو نہایت کامیاب بنایا۔ ہر طرف سے واہ واہ سبحان اللہ کی آواز بلند ہوئی قطعہ بار بار پڑھوایا گیا۔ پھر آپ نے اسی انداز میں اپنی غزل سنائی۔ مطلع بہت خوب تھا۔

دنیائے تصور ہم آباد نہیں کرتے
یاد آتے ہو تم خود ہی ہم یاد نہیں کرتے

جناب خیر کو متوجہ کرکے فنا نے اپنا دوسرا شعر سنایا

وہ جور مسلسل سے باز آ تو گئے لیکن
بیداد یہ کیا کم ہے بیداد نہیں کرتے

اس شعر پر ادھر اُدھر سے تو کچھ داد ملی مگر جناب خیر تو محض سر ہلاتے رہ گئے۔ غالباً وہ اس وقت غالب کے شعر سے محظوظ ہو رہے تھے۔

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

پھر جناب فنا نے تمہید کے طور پر ایک جملہ ارشاد فرمایا۔ "شعر ہے شاید کسی قابل ہو۔ بہت سے زندگی کے حادثات کا آئینہ ہے ایک مثال اس کی مصر موجود ہے۔

ساحل کے تماشائی ہر ڈوبنے والے پر
افسوس تو کرتے ہیں امداد نہیں کرتے

شعر واقعی ہر طرح قابل قدر ہے۔ ہر طرف سے واہ واہ ہونے لگی اور جناب فنا کو یہ شعر بار بار سنانے کی زحمت دی گئی۔ اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا۔

کچھ درد کی شدت ہے کچھ پاسِ محبت ہے
ہم آہ تو کرتے ہیں فریاد نہیں کرتے

آہ اور فریاد کا یہ لطیف فرق اور اس کی توجیہ نہایت ہی خوب ہے۔ غرض اس شعر کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ محفل پر بھی اس کا اثر ہوا اور یہ شعر بھی جناب فنا سے بار بار پڑھوایا گیا۔ پھر آپ نے آخری شعر ارشاد فرمایا۔

ہم مصلحتاً اپنا افسانہ بھلا بیٹھے
کچھ یاد نہیں آتا کچھ یاد نہیں کرتے

فنا صاحب نے غزل ختم کی ہر طرف سے واہ واہ سبحان اللہ کا شور تھا۔ تالیاں پٹ رہی تھیں صاحب سے ایک اور غزل سنانے کی درخواست ہو

سے ہونے لگی۔ جناب صدر نے حاضرین کو یقین دلایا کہ فنا صاحب کو دوبارہ زحمت دی جائے گی۔ پھر آپ نے جناب ڈاکٹر پرشاد گوہر دہلوی سے درخواست کی کہ وہ اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمائیں۔ جناب گوہر مائیک کے سامنے بیٹھ گئے۔ آپ اونچے قد اور سانولے رنگ کے ہیں۔ گول چہرہ پر ایک معصومیت ایسی ضرور ہے جس سے محفل پر اچھا اثر ہوتا ہے۔ آپ دہلی کے مشہور رسالہ شعلہ وشبنم سے متعلق ہیں۔ آپ کے بھائی صاحب سری بل جین اس کے اڈیٹر ہیں۔ گوہر صاحب آغا شاعر قزلباش کے شاگرد رشید ہیں۔ کلام میں بھی اسی طرح کا سوز وگداز پایا جاتا ہے۔ شعر تحت اللفظ سناتے ہیں۔ اور خوب سناتے ہیں۔ آواز ایسی پائی ہے کہ محفل مشاعرہ مرعوب ہوجاتی ہے۔

مائیک پر تشریف لانے کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا " اپنے استاد افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش قبلہ کے دو شعر پہلے سنانے کا فخر حاصل کرتا ہوں اس کے بعد اپنا کلام پیش کروں گا۔ استاد قبلہ فرماتے ہیں۔

سوز فرقت نہ بجھے گا کسی پہلو دل میں،
کاش آنکھوں سے برسنے لگیں آنسو دل میں
پھر وہی ٹیس وہی درد وہی بے چینی
چارہ گر آگ لگا دے کسی پہلو دل میں،

پھر جناب گوہر نے اپنے بعض قطعات سنائے پہلے قطعہ پر تو گوہر صاحب کو بہت داد ملی اور یہ قطعہ بار بار پڑھوایا گیا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

جناب مومن وغالب کا پرچم لے کے آیا ہوں
یہاں گنگ وجمن سے آب زمزم لیکے آیا ہوں
تعلق ہے جسے اردو زباں کی کامیابی سے
وہ عہد استوار وعزم محکم لے کے آیا ہوں

جناب گوہر نے اور دو قطعات پیش کئے۔

(۱) دئے ہیں داغ اور غالب نے جو جذبات اردو کو
میں ان جذبات کی رو میں تمہارے پاس آیا ہوں
جو موجیں کوثر وتسنیم کی اٹھی تھیں دلی میں
انہی موجوں کو لے کر آج میں مدراس آیا ہوں

(۲) جگمگاتی حسین راتوں میں،
دل نے چھیڑا ہے زندگی کا رباب
پھر کسی کی حسین آنکھوں سے
مے پرستوں کو مل رہی ہے شراب

جناب گوہر نے قطعات سنانے کے بعد ایک غزل پیش کی۔

(۳) دل کی بیتابی کا حاصل دل کے افسانے کی بات
حیف فرزانے نہ سمجھے ایک دیوانے کی بات
آئے اور آتے ہی فرمانے لگے جانے کی بات؟
پھر وہی تم نے نکالی دل کے تڑپانے کی بات؟
عشق کی ہنگامہ آرائی ہے اب وجہ سکوں
تذکرہ کعبے کا کیجے اور نہ بتخانے کی بات
حُسن کی رسوائیاں ہوں اور گوارا عشق کو؟
زندگی کی ہیں یہ باتیں یا ہے مرجانے کی بات؟

اس شعر پر خوب داد ملی صدر محترم اور حضرت انور صابری صاحب نے بھی داد دی۔ گوہر صاحب سے یہ شعر بار بار پڑھوایا گیا۔ پھر گوہر صاحب نے اس غزل

کے دوسرے اشعار ارشاد فرمائے۔

کس کو سمجھائے کوئی رازِ دنیا ز حسن وعشق
یہ سمجھنے کے ہیں پہلو اور نہ سمجھانے کی بات
بے خودی زانو پہ سر اور ان کے دامن کی ہوا
کیجئے گوہر نہ ہم سے ہوش میں آنے کی بات

مقطع پر ایک ہلچل سی مچ گئی۔ ہر سمت سے واہ واہ کا شور بلند ہوا۔ مقطع بار بار پڑھوایا گیا۔ اور تو اور مولوی الحاج سید عبدالوہاب صاحب بخاری قبلہ بھی اس شعر سے بہت متاثر ہوئے۔ جب مجمع قدرے خاموش ہوا اور گوہر صاحب اپنی جگہ پر جانے لگے تو مولانا بخاری نے پھر درخواست کرکے آپ سے مقطع پڑھوایا۔ گوہر صاحب کے بعد جناب امیر دہلوی مائیک کے پاس آئے اور اپنا کلام سنایا۔ یہ نوجوان شاعر علامہ اکو ر صابری کے ساتھ مدراس تشریف فرما ہوئے۔ علامہ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ شعر ترنم سے سناتے ہیں۔ نیچے سُروں میں چھوٹی بحر کی غزل سنائی۔ ایک دو شعر پر داد بھی ملی۔ آپ بھی دو تین شعر ملاحظہ فرمائیں۔

حرم کو جانبِ نظر دیکھتا ہوں — ہر طرف جلوہ گر دیکھتا ہوں
آپ کے باخبر عاشقوں کو — آپ سے بے خبر دیکھتا ہوں
میں دو عالم کی ہر ایک شے کو — آپ کو دیکھ کر دیکھتا ہوں
اے امیر اپنی چشمِ یقیں سے — جلوۂ معتبر دیکھتا ہوں

امیر صاحب نے اپنی طویل غزل ختم کی تو جناب صدر نے جناب شاہد صدیقی حیدرآبادی سے کلام سنانے کی درخواست کی۔ تعارف کرتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا "جناب شاہد کے متعلق حضرت جگر رئیس المتغزلین نے جن تعریفی الفاظ میں ذکر فرمایا۔ اس کے بعد میرا کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ جناب شاہد مائیک کے قریب آئے۔ میانہ قد، گول چہرہ کچھ بکھرے ہوئے بال جن سے شاعرانہ پریشانی ظاہر ہوتی ہے اور پھولے ہوئے کچھ اس طرح ہیں کہ میانہ قد مائل بہ پستی نظر آرہا ہے۔ ایک تمہید کے ساتھ غزل سنانی شروع کی فرمایا: "غزل پر خاص طور سے بڑا اعتراض رہا ہے کہ اس میں انفرادی تجربات نقل کئے جاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ غزل میں اجتماعی انداز آگئے ہیں شاعر اپنے دل کی بات کو دنیا کی بات بنا دیتا ہے اور دنیا کی بات کو اپنی بات۔" پھر شاہد صاحب نے اپنی غزل پیش کی۔

ظلمتوں پہ شب کی جب کچھ نظر نہیں ہوتی
رات بیت جاتی ہے اور سحر نہیں ہوتی
آسماں پہ بادل ہے کوئی راگنی چھیڑ دو
آہ ایسے موسم میں کارگر نہیں ہوتی
جب کوئی نہیں سنتا بات دردمندوں کی
بات اور بڑھتی ہے مختصر نہیں ہوتی
رات کے اندھیروں میں کتنے دل جلتے ہیں
صبح کے ستاروں کو کچھ خبر نہیں ہوتی

جناب شاہد صاحب کی غزل نہایت ہی اعلیٰ معیار کی تھی مگر ہمیں کچھ ایسا گمان پڑتا ہے کہ بزمِ مشاعرہ کے اکثر افراد ان اشعار کی رمزی کیفیتوں سے آشنا نہ ہو سکے۔ صرف شعرا اور جناب صدر آپ کے اشعار کی داد دیتے رہے۔ شاہد صاحب کے بعد جناب نظر بنارسی کو زحمت دی گئی۔ یہ بھاری بھر کم کے آدمی جتنے ہی آپ پست قامت ہیں اتنا ہی بلند قد

شعر ارشاد فرماتے ہیں۔ ترنم سے شعر سناتے ہیں۔ آپ کے ترنم میں بھی سوز کی کیفیت ہوتی ہے ایک ہی طرز میں شعر سناتے ہیں۔ اس لئے اکثر محاسن کلام کے باوجود بزم مشاعرہ میں رنگ پھیکا ہو جاتا ہے۔ غزل خوب سنائی تھی مگر حاضرین سے جیسی داد ملنی تھی نہیں ملی۔

چلے اٹھ کے بزم سے دو قدم تو قدم ہی پھر اٹھا سکے
جو نگاہِ مست سے بچ گئے وہ ادا سے بچ کے نہ جا سکے
وہ مرا نصیب جگا کے بھی مری حسرتیں نہ جگا سکے
وہ پلٹ کے آ گئے گر گئے دن پلٹ کے نہ آ سکے
بڑی آرزو تھی کہ جائیں گے وہ بلانے جب کبھی آئیں گے
وہ بلا گئے مگر اس طرح کہ بلانے پر بھی نہ جا سکے
یہ غرورِ عشق کی سختیاں یہ لحاظِ بزم کہ الاماں
جو بلا دے بزم کی بزم کو وہ زبان تک نہ ہلا سکے
اے نذیر دیکھ لو آج بھی مرے چہرے پر وہی تازگی
مجھے رنج تو دے گئے مگر وہ مری ہنسی نہ اڑا سکے

جناب نذیر بنارسی کے بعد جناب جلال کرڈپوی کی باری آئی۔ آپ اسلامیہ کالج وانمباڑی کے اردو لکچرار ہیں۔ شعر ترنم سے سناتے ہیں۔ آواز نہایت خوش آئند ہوتی ہے۔ آپ کی نظم آپ کی غزل سے بھی زیادہ خوب اور مرغوب ہوتی ہے۔ اس وقت غزل سنائی تھی۔ دو شعر ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں

تکلیف گوارا ہے ہم کو تحقیر گوارا کون کرے
اک بار گوارا ہو تو ہو ہر بار گوارا کون کرے
کشتی بھی شکستہ کشتی ہے قسمت بھی شکستہ قسمت ہے
پر ہول شکستہ عالم میں ساحل کی تمنا کون کرے

اس کے بعد جناب اثر مجیدی حیدر آبادی نے اپنا کلام سنایا۔ یہ ترقی پسند ادیب ہیں۔ شعر تحت اللفظ سناتے ہیں۔ آواز زیادہ بلند نہیں کر سکتے۔ اس لئے آپ کے پڑھنے سے بہت کم اثر پیدا ہوتا ہے۔ غزل کہی تھی۔

ذرے بھی ہمارے اپنے ہیں تارے بھی ہمارے اپنے ہیں
ان سب میں ہماری ہستی ہے ان سب میں نظارے اپنے ہیں
جب تک کہ سلامت کشتی ہے جب تک بھی سکت ہے بازو میں
امواج کی یورش اپنی ہے طوفان کے دھارے اپنے ہیں
اے دل یہ دھڑکوں کا عالم پائندہ نہیں لمحاتی ہے
کچھ دیر ٹھہر جا دم لے لے پھر سارے نظارے اپنے ہیں

جناب اثر مجیدی کے بعد صدر محترم نے جناب شوق بہرائچی سے کلام سنانے کی درخواست کی۔ جناب شوق دوسری دفعہ مدراس تشریف لائے تھے۔ سمینار کے تیسرے سالانہ مشاعرے میں آپ کا رنگ خوب جما۔ لوگوں کو بھی یہی توقع تھی کہ شوق وہی شوق ہونگے جنہوں نے پچھلے سال اپنے اشعار سے محفل مشاعرہ کو گرما دیا تھا۔ مگر شوق صاحب اس سال کچھ بجھے بجھے سے نظر آئے۔ آواز بہت نحیف ہو چکی ہے منہ میں دانت نہ ہونے کی وجہ سے الفاظ صاف سنائی نہیں دیتے۔ اگر دانت بنوالیں تو شاید بہتر پڑھ سکیں۔ اس مشاعرے میں ان سب پر طرہ یہ ہوا کہ جناب شوق راستہ میں بیمار ہو گئے تھے۔ مشاعرے میں بہت کھانستے رہے اور رک رک کے شعر سناتے تھے پھر بھی لوگ کمال توجہ سے سنتے رہے اور جہاں ایک آدھ شعر سمجھ میں آ گیا خوب داد بھی دی۔

قطعات ملاحظہ ہوں

کیا شیخ و برہمن کا چرچا کیا گورے کیا کالے ہیں
یہ لوگ بھی سمجھے بوجھے ہیں یہ لوگ بھی دیکھے بھالے ہیں
اللہ غنی اس دنیا میں سرمایہ پرستی کا عالم
مفلس کا کوئی بہنوائی نہیں زردار کے لاکھوں سالے ہیں

زبان کے متعلق ایک قطعہ فرمایا۔

یہ مانا آپ کی بیداریاں کچھ اور کہتی ہیں
ذرا سنئے تو ذمہ داریاں کچھ اور کہتی ہیں
ہمیں کیا ہم تو حسب الحکم ہندی لکھتے پڑھتے ہیں
مگر حکام کی دشواریاں کچھ اور کہتی ہیں

اس قطعہ پر بہت داد ملی۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا۔
چند شعر غزل کے ملاحظہ ہوں

کبھی خوئے بتاں مائل بہ احساں ہو نہیں سکتی
کوئی سوتیلی ماں ہرگز سگی ماں ہو نہیں سکتی
تمہاری بات کا واعظ اثر کچھ ہو نہیں سکتا
تمہاری طرح کل مخلوق شیطاں ہو نہیں سکتی
تمہاری رہبری بیکار ہے صحن گلستاں میں
یہ کبھی تین کی شمع شبستاں ہو نہیں سکتی
تمہاری کج ادائی فطرتی ہے جا نہیں سکتی
یہ دُم کتے کی ہے سیدھی مری جاں ہو نہیں سکتی

شوق صاحب کے بعد جناب سلیمان اریب حیدرآبادی مائک کے پاس آئے اور غزل سنائی۔ غزل کچھ اس انداز میں سنانے لگے کہ گویا فنا فی الشعر ہو چکے ہیں۔ آغاز بہت مرعوب ہے مگر خود شعر پر ان کا ترنم اس حد تک چھا جاتا ہے کہ اس کے محاسن مجمع پر ظاہر نہیں ہونے پاتے۔ غزل کہی تھی۔

پرسشِ حال وہ اس طرح سے فرماتے ہیں
مسکرانے پہ بھی کچھ اشک چھلک آتے ہیں
عشق میں اور نہ جانے ابھی کیا ہوتا ہے
اب فقط دل میں کہیں ایک خلش پاتے ہیں
جیسے اک لمحہ کو رک جاتی ہے نبضِ عالم
جب مرے پاس سے وہ ہو کے نکل جاتے ہیں
خالی خالی نظر آتا ہے یہ آباد جہاں
جب تری بزم سے ہم اٹھ کے چلے آتے ہیں
چھڑ نہ جائے کہیں پھر قصۂ کفر و ایماں
سو ترا نام بھی کہتے ہوئے گھبراتے ہیں
وقت آئے تو اٹھا لیتے ہیں تلوار بھی ہم
اب ترے سایۂ گیسو میں غزل گاتے ہیں

جناب اریب نے غزل ختم کی تو صدر محترم نے جناب خیر ہوروی سے درخواست کی کہ وہ اپنی غزل سنائیں۔ جناب خیر مسکراتے ہوئے آگے بڑھے اور فرمایا۔ میں مولانا عبدالحق کے روحانی اثر سے مدراس میں آکر شاعر بن جاتا ہوں۔ مجھے مولانا صابری کا مقدمۃ الجیش سمجھئے۔ صدر کے حسب الحکم کچھ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

عالمِ تنہائی ہے میں ہوں سکوتِ شام ہے
زندگی یہ ہے تو یارب موت کس کا نام ہے

مطلع پر خوب واہ واہ ہو رہی ہے۔ دوبارہ ارشاد کے نعرے بلند ہیں۔ صدر محترم ارشاد فرما رہے ہیں "کتنا مکمل مطلع ہے"۔ مولوی بخاری صاحب مطلع پڑھ رہے ہیں اور مزے لے رہے ہیں۔ خیر صاحب نے مطلع دو تین دفعہ سنایا اور پھر حسن مطلع ارشاد فرمایا۔

مستیٔ صہبا ہے ساقی ہے سرورِ جام ہے
میکدہ کا میکدہ اِک بزمِ عشرت کام ہے
عشق اپنی آرزوؤں میں اگر ناکام ہے
بندہ پرور! آپ پر بھی کچھ نہ کچھ الزام ہے

اس شعر پر خوب داد ملی ہے اور بار بار پڑھوایا گیا ہے پھر ارشاد ہوتا ہے۔

ہر نفس ہم سازِ مینا ہر نظر موجِ شراب
مست نظروں کا کرشمہ میکدہ کا نام ہے
حسنِ کافر کی ادا کو کوئی کچھ کہتا نہیں
عشق کی سادہ مزاجی موردِ الزام ہے
کیف اندر کیف یعنے بیخودی در بیخودی
عشق کیا ہے اک مسلسل لغزشوں کا نام ہے

اس شعر کو بھی جناب خیر کو بہت داد ملی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا۔

مجھ سے چھپ کر میری نظروں میں ہیں جو حسن کے
خیر معراجِ محبت کیا اسی کا نام ہے۔

جناب خیر نے اپنی غزل ختم کی تو لوگ سمجھ گئے کہ اب انور صابری قبلہ تشریف لا رہے ہیں۔ جنابِ صدر نے آپ کی طرف مسکراتے ہوئے نظر کی۔ حضرت انور صابری اپنے مقام سے اٹھے۔ تالیوں کا شور بلند ہوا اور جب مولانا مائیک کے سامنے آئے تو لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ مولانا نے ارشاد فرمایا۔ "یہ غزل کارکنانِ اردو سیمنار کی خدمت میں پیش کرتا ہوں" اس غزل میں آپ نے بہت سی تلمیحات پیش کی ہیں جن سے ہمیں یقین ہے، کارکنانِ سیمنار ضرور محظوظ ہوئے ہوں گے۔

اربابِ محبت کو غم کے سانچوں میں بھی ڈھلنا پڑتا ہے
جس راہ پہ کانٹے ہوتے ہیں اس راہ پہ چلنا پڑتا ہے
اے ہمسفرانِ جادۂ دل ہر گامِ سفر پر تا منزل
اُفتاد پہ اُفتاد آتی ہے گر گر کے سنبھلنا پڑتا ہے

یہ شعر سنا کر انور صابری قبلہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر مولانا بخاری صاحب اور مولانا ڈاکٹر عبدالحق کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا

تعمیرِ چمن کے جلووں کو تا حدِ چمن محدود نہ کر
خوشبوئے رہِ چمن کو گلشن سے باہر بھی نکلنا پڑتا ہے
جمہور کے خدمتگاروں کو یہ رازِ حقیقت سمجھاؤ
پروانے کے جلنے سے پہلے خود شمع کو جلنا پڑتا ہے

پھر مولانا رک گئے ان کی وہ دلکش آواز، الفاظ میں لطیف اشارے اور ان کا پڑھتے پڑھتے ڈرامائی طور پر رک جانا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا جلوہ آرائی ہو رہی ہے اور لوگ محوِ تماشہ ہیں۔ آپ نے مجمع پر ایک غائر نظر ڈالی۔ مائیک سے ایک قدم پیچھے ہٹے اور اپنے چہرے سے کسی بیکلی کا اظہار کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمانے لگے۔ "کیفیاتی طور پر اس کا ایک پس منظر پیش کرتا ہوں" پھر مولانا رک گئے۔ اِدھر ادھر اس طرح دیکھنے لگے کہ گویا جان بوجھ کر اپنے آپ کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ پھر آپ مائیک سے قریب ہوئے اور کہا "پھر میری اپنی بات ہے کیا کروں" اب تو شعر حلق میں ٹھیر نہ سکا تڑپ کر نکل ہی گیا۔

مضرابِ اثر سے روحوں کے تاروں کو ملانا لازم ہے
جس راگ کو دنیا سن نہ سکے وہ راگ سنانا پڑتا ہے

فطرت کے تقاضوں پر اکثر الفاظ کی مٹھی تانوں سے
ہنستوں کو رلانا پڑتا ہے روتوں کو ہنسانا پڑتا ہے
پھر مولانا اسی طرح رک گئے۔ پھر ادھر اُدھر مڑ کے دیکھا
اور ارشاد فرمایا "کاش میری اس بات کو سمجھ سکیں"
آرائش گلشن کی خاطر اے بے خبرانِ رازِ چمن
شاخوں کا گلوں کی ذکر ہی کیا کانٹوں کو سجانا پڑتا ہے
تنویرِ جنوں کی منزل میں دیکھا ہے یہ عالم بھی ہم نے
جلتی ہوئی عقل و دانش کی شمعیں بھی جلانا پڑتا ہے
حالات سے گھبرانے والو ۔۔۔۔۔
پھر قبلہ رک گئے پھر ایک نامعلوم بیکلی ظاہر فرمائی
اور کمالِ مایوسی کے ساتھ درد و کرب کے عالم میں
ارشاد فرمایا "میں کیا کروں !" اور پھر مصرعہ دہرایا
حالات سے گھبرانے والو شاید یہ تمہیں معلوم نہیں
فتنوں کو دبانے کی خاطر فتنوں کو جگانا پڑتا ہے
پھر ارشاد ہوا "اظہار واقعہ ہے خوشامد نہیں۔
ایثارِ جلال و فیضانِ علامہ عبدالحق کی قسم
جب خیر بلاتے ہیں انورؔ مدراس بھی آنا پڑتا ہے
مولانا نے غزل ختم کی۔ تالیوں کے شور اور واہ واہ
کے غوغے سے گویا گھبرا کر اپنی جگہ پر آ ہی رہے تھے
کہ خیر صاحب نے فرمایا۔
جب خیر بلاتے ہیں انورؔ مدراس بھی آنا پڑتا ہے
اس خیر کی گزارش ہے کہ ایک اور غزل سنا دیں۔ مولانا
مسکرا کر پھر مائک کی طرف آئے تالیوں کا شور اور بڑھ گیا،
خردمندوں سے ملتے ہیں نہ فرزانوں سے ملتے ہیں
عزیز !!!
محبت کے جو دیوانے ہیں دیوانوں سے ملتے ہیں
میری اپنی زندگی ہے !
حرم تک جانے والے راستے دنیائے عرفاں میں
خدا کے خاص بندوں کو صنم خانوں سے ملتے ہیں
پھر آپ نے ایک غزل سنائی:-
مانا کوئی فکرِ قفس و دام نہیں ہے۔
ہوں صحنِ چمن میں مگر آرام نہیں ہے
ہے طعنۂ تخریبِ چمن اہلِ چمن پر
صیاد پہ لیکن کوئی الزام نہیں ہے
میں نے ہی تو میخانے کو میخانہ بنایا
میرے ہی مقدر میں کوئی جام نہیں ہے
مولانا کو اس شعر پر ہر طرف سے داد ملنے لگی۔ مگر اس شور و غوغے میں کسی منچلے کی آواز آئی "صبر کیجئے !" مولانا بھی کب دبنے والے تھے فوراً جواب دیا۔ حضور میں انورؔ صابری ہوں مجھے صبر کی کوئی کیا دعوت دے گا ! پھر مقطع ارشاد فرمایا۔
جمہور کے ذہنوں میں جگہ پا نہیں سکتا۔
جس شعر میں انورؔ کوئی پیغام نہیں ہے
ایک ہنگامہ برپا ہو رہا تھا۔ مسلسل تالیوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ صدر محترم نے کسی کا نام لیا کسی نے سنا کسی نے نہ سنا۔ اس ہنگامہ میں مائک کے سامنے ایک میانہ قد سانولے رنگ کا آدمی کھڑا ہوا۔ لوگوں نے دریافت کرنا شروع کیا کہ کون ہیں پھر صدر محترم نے اعلان فرمایا۔ "آپ ناوک لکھنوی ہیں ۔ ظریفانہ شعر کہتے ہیں ۔ ناوک صاحب نے معتقد و بانی سمینار کی خدمت میں ایک قطعہ سنایا، جس میں بھی ظرافت کو دخل تھا۔

مدراس آکے دیکھی جو صورت جلال کی
دنیا بدل کے رہ گئی حیرت خیال کی
کرتے ہیں اس طرح سے یہ اردو کی پرورش
اک باپ جیسے کرتا ہے اہل و عیال کی

داد تو ملی مگر ناوک صاحب کا اصل رنگ ظاہر نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے غزل شروع کی۔ کلام ترنم میں سناتے ہیں۔ ترنم اس طرح کا ہوتا ہے کہ گویا نالہ پابندِ نے ہو گیا ہے۔ مگر مطالب اور الفاظ کی ترکیب کچھ ایسی دلنشین ہوتی ہے کہ لوگ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے ہیں۔ ناوک صاحب لوگوں کو تو خوب ہنسلاتے ہیں مگر کیا مجال جو زیر لب مسکراہٹ ہی نمایاں ہو۔ ذیل میں ہم ناوک صاحب کی غزل پیش کر رہے ہیں اگر آپ نے بغیر ہنسنے کے یہ غزل پڑھ لی تو ہم کہیں گے کہ بڑا کمال کیا۔

عشق کا اب طریقہ پرانا نہیں،،
ایک پرجان دو میں وہ زمانہ نہیں،
اس کی بدقسمتی کا ٹھکانا نہیں،
جس کا ان کے یہاں سمدھیانہ نہیں

اس شعر پر ناوک صاحب کو خوب داد ملی۔ ہر وہ نوجوان گویا جو ملازمت کے لئے کوشش کر کے تھک گیا تھا۔ یہی سمجھنے لگا کہ ناوک صاحب نے اس کی بپتا کہی ہے۔

ہم نے ٹھینگے پہ مارا ہے ماں باپ کو
تم بھی گویا کچھ دھونس کھانا نہیں
پھیرتے ہیں گلے پر وہ الٹی چھری
اور یہ حکم ہے غل مچانا نہیں

رہ بے تماشہ مری جھونج میں گھس پڑیں
بجلیوں کا کہیں کیا ٹھکانا نہیں
ان کے دالان کی کوٹھڑی گر پڑی
آشیانے میں اب آشیانہ نہیں
دیکھ الفت کے ٹوٹ کہیں تھان پہ
حسن کو دیکھ کر ہنہنانا نہیں
جوروں کو پھراتے ہیں ہمراہ جو
ان کی بے غیرتی کا ٹھکانا نہیں
بہتے دریا کے اندر قفس گر پڑا
پانی موجود ہے اور دانہ نہیں
حکم ناوک یہ ہے باغباں کا عجب
پیڑ گننا مگر آم کھانا نہیں

ناوک کے ہر شعر پر داد ملتی رہی اور جب مقطع پر پہنچے تو دوسری غزل سنانے کی درخواست ہر طرف سے ہونے لگی۔ ناوک نے غزل سنائی۔

جس دن سے خدا رکھے دیسی ہیں کچھ میخانے
بدلی کا تو پینا ہے کلبڑ کے ہیں پیمانے
لے جاتے ہیں بیوی کو جو ساتھ میں ٹہلانے
ظاہر میں تو فیشن ہے باطن کی خدا جانے

اس شعر پر بے حد داد ملی اور بار بار پڑھوا گیا۔

کیا ٹیکس برابر کا سرکار نے باندھا ہے
مرغی کے بھی دو آنے مرغے کے بھی دو آنے
ناصح نے جو کی باتیں کل شب کو خدا لگتی
تو صبح کو بیچارے بلوائے گئے تھانے

مقطع کہا ہے:۔ سر پیچ کو رشوت سے نفرت ہے بڑی ناوک
وہ صرف مرغ میں لے لیتا ہے نذرانے

ناوک کے بعد مشاعرہ میں رنگ جمانا آسان کام نہیں ہے۔ گو حسرت سہروردی برا نہیں کہتے اور شعر دلاویز ترنم سے سناتے ہیں۔ پھر بھی اس وقت رنگ جم نہ سکا۔ غزل کا مطلع تھا۔

غمِ دوراں سے بڑھ کر غم نہیں ہے
غمِ جاناں میں کچھ دم خم نہیں ہے

حسرت نے غزل ختم کی تو صدرِ محترم نے جناب ...... سید عظمت اللہ صاحب سرمدی لکچرار اسلامک ہسٹری گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس سے غزل سنانے کی درخواست کی۔ آپ کی غزل کے دو شعر ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

بزمِ طرب ہے یہ جہاں رنگِ طرب جمائیے
نغمۂ جاں گداز پر میرے کبھی نہ جائیے
کوچۂ آرزوئے دل نذرِ خزانِ یاس ہے
بن کے نسیمِ صبح پھر جانِ بہار آئیے

جناب سرمدی کے بعد جناب کاوش بدری نے اپنی غزل سنائی۔ یہ آمبور کے نوجوان شاعر ہیں "ترقی پسند" شاعری سے بہت لگاؤ رکھتے ہیں۔ اور کلام ترنم سے سناتے ہیں۔ بڑا دلاویز ترنم ہے ہم آپ کے کچھ شعر اس وقت ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

بام و در پہ صدیوں سے یورشیں ہیں ظلمت کی
روشنی کے پاؤں میں بیڑیاں مصیبت کی،
جان کم خریدارو جان کر تو باز آؤ
سن رہا ہوں میں آہٹ دیر سے قیامت کی
برگِ گل کی جنبش سے کیوں لہو ٹپکتا ہے۔
کیا خزاں کے لشکر نے پھر چمن پہ ہمت کی

کاوش صاحب نے غزل ختم کی تو مولوی الحاج عبدالباری صاحب حادی مائیک کے پاس تشریف لائے۔ دراز قد، مولیانہ قسم کا لباس۔ باوجود اس رنگ کے کلام میں رنگینی ضرور ہوتی ہے۔ غزل تحت اللفظ میں سناتے ہیں۔ پڑھنے کے انداز بہت خوب ہیں۔ آپ کے کچھ شعر ناظرین کے ملاحظہ کے لئے ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

واہ کیا جوشِ جنوں برہم زنِ کاشانہ ہے
دیکھتا ہوں جس طرف ویرانہ ہی ویرانہ ہے
ہر جگہ کیا کارفرمائی ہے حسن و عشق کی
اس جہانِ رنگ و بو میں جو بھی ہے دیوانہ ہے
میں اسی پیرِ مغاں کا ہوں مریدِ رند خو
رہنمائے خضر جس کی لغزشِ مستانہ ہے
دیکھئے انجامِ عشقِ حادیٔ خستہ جگر
اب نہ وہ بیکس نہ اب اس کا کہیں افسانہ ہے

جناب حادی کے بعد جناب ضیا کو بار دیگر تکلیف دی گئی آپ نے ایک غزل سنائی جس کے بعض اشعار درج ذیل ہیں۔

احساسِ الم زخمہ زنِ ساز نہیں ہے
ٹوٹے ہوئے دل کی کوئی آواز نہیں ہے
وہ عشق کوئی عشق ہے اے اہلِ طریقت
جو حسن کی محفل میں سرافراز نہیں ہے
یا نغمۂ بلبل میں نہیں سوزِ محبت!
یا خندۂ گل آج جنوں ساز نہیں ہے
لے جانِ ضیا بڑھ ہی گیا چشمِ ہوس پر
پردہ جو ترے حسن کا غماز نہیں ہے۔

ہم نے اوپر عرض کر دیا ہے کہ جناب شوق
بہرائچی اس سال مشاعرے میں بہت بجھے بجھے سے تھے
منجملہ اور اسباب کے ایک سبب یہ بھی تھا کہ طبیعت
کی ناسازی کی وجہ سے آپ بہت کھانس رہے
تھے۔ گویا کھانسی تکیہ کلام بن گئی تھی۔ دو قطعے
اور ایک غزل سنائی۔ آپ کے دو قطعے ملاحظہ ہوں

(۱) میں دیکھتا ہوں رنگ زمانے کے اور ہیں
طور اور طریق دام میں لانے کے اور ہیں
قول و عمل کا فرق یہ کہتا ہے صاف صاف
کھانے کے دانت اور دکھانے کے اور ہیں

(۲) غنچہ و گل ہیں نہ محفوظ، نہ کانٹا محفوظ،
اس گلستاں میں نہیں کوئی بھی تنکا محفوظ
غم روزی سے نہیں کوئی بھی اصلا محفوظ
اس مصیبت سے اگر ہیں بھی تو بنیا محفوظ

پھر جناب شوق نے غزل سنائی۔

مشورے ہوتے ہیں دن رات یہ دیوانوں میں
منتقل سارے دفاتر ہوں بیابانوں میں
ہم جو ڈوبے تو زمانے ہی کو لے ڈوبیں گے
باندھ رکھے ہیں گلے سب کے گریبانوں میں
صنف نازک کی طرف جھوٹوں کی نظریں اٹھیں
کسی قابل نہ رہا جب کوئی مردانوں میں

اس شعر پر خوب داد دی گئی اور جناب شوق پھر
وہی پہلے شوق نظر آنے لگے۔

سنتے سنتے مری روداد وہ سو جاتے ہیں
جیسے افیون گھلی ہے مرے افسانوں میں

آج واعظ جو ہیں میخانے میں رونق افروز
یہ لکڑ بھگا کہاں آ گیا انسانوں میں

آخری شعر پر خوب ہنسی ہوئی۔ مولوی حضرات بھی
مسکرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

جناب شوق کے بعد صدر محترم نے جناب فنا
سے شعر سنانے کی درخواست کی آپ نے ایک غزل
سنائی جس کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں۔

یہ بہار کا زمانہ یہ حسین گلوں کے سائے
مجھے ڈر ہے باغباں کو کہیں نیند آ نہ جائے
ترے وعدوں پر کہاں تک مرا دل فریب کھائے
کوئی ایسا کر بہانہ مری آس ٹوٹ جائے

اس شعر پر فنا صاحب کو غضب کی داد ملی۔ کئی بار
پڑھوایا گیا۔ پھر انہوں نے ارشاد فرمایا۔

کھلے اب کے گلستاں میں گل نامراد ایسے
نہ بہار ہی نے پوچھا نہ خزاں کے کام آئے

اس کے بعد آپ نے ایک غزل سنائی۔

کوئی سمجھے گا کیا راز گلشن،
جب تک الجھے نہ کانٹوں سے دامن
کیسے پلٹے کوئی تیرا آسکن،
راہ روکے ہیں شیخ و برہمن
یک بیک سامنے آ نہ جانا،
رک نہ جائے کہیں دل کی دھڑکن

اس شعر پر بھی فنا صاحب کو خوب داد ملی۔

عظمت آشیانہ بڑھا دی
برق کو دوست سمجھوں کہ دشمن

وہ ہیں شرمندہ اپنے کرم پر
میں پشیماں ہوں پھیلا کے دامن
گل تو گل خار تک چن لئے ہیں
پھر بھی خالی ہے گلچیں کا دامن
حسن ہے یوں پریشاں پریشاں
لٹ گیا ہو کوئی جیسے رہزن
اے فنا حسن پر بٹ کے تونے
کر دیا عشق کا نام روشن

فنا صاحب کے بعد جناب صدر نے گوہر صاحب سے پڑھنے کی درخواست کی۔ آپ نے ایک غزل سنائی۔

زلفوں کی گھنیری چھاؤں میں سرشاری ہے بھی عام نہیں
وہ بزم بھی کوئی بزم نہیں جس بزم میں دورِ جام نہیں
دل خود ہی ہے وجہ بربادی یہ بات مجھے تسلیم بھی ہے
تم مفت پشیماں ہوتے ہو تم پر تو کوئی الزام نہیں
اے مونسِ غم کچھ غور تو کر یہ رازِ جنوں ہے رازِ جنوں
اس رازِ جنوں کو پہچانے یہ ہوش و خرد کا کام نہیں
مہجور سہی رنجور سہی، ناکام سہی ناشاد سہی
بٹ جائیں جو راہِ الفت سے گوہر یہ ہمارا کام نہیں

اب محفل سے مختلف آوازیں آنے لگیں۔ بعض حضرات فنا صاحب سے پھر سننا چاہتے تھے۔ بعض ناوک صاحب سے اور بعض ستبش سے۔ صدر محترم نے ارشاد فرمایا "اگر مشاعرے کو مختلف اور متضاد خواہشوں پر چھوڑ دیا جائے تو پھر محفل مشاعرے کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہے" اس آواز نے مجمع پر جادو کا سا کام کیا۔ بیک وقت مجمع ساکت ہو گیا۔ صدرِ محترم نے سہیل صاحب ساحر گورکھپوری سے کلام سنانے کی درخواست کی۔ ساحر نے غزل سنائی۔

کہیں اہلِ ہوس کا امتحاں ہوتا تو کیا ہوتا
رہِ الفت میں یہ سنگِ گراں ہوتا تو کیا ہوتا
جب اتنی کج ادائی پر بھی میخانہ نہیں چھوٹا
اگر پیرِ مغاں کچھ مہرباں ہوتا تو کیا ہوتا
جبیں کی آبرو رکھ لی مری وحشت نے اے ساحر
سرِ شوریدہ وقفِ آرزو ہوتا تو کیا ہوتا،

ساحر کے بعد صدرِ محترم نے امیر دہلوی کے نام کا اعلان کیا۔ انھوں نے غزل سنائی۔

جلوۂ مختصر چاہتا ہوں آپ کی اک نظر چاہتا ہوں
ان کی صورت انہی کی تجلی چار سو جلوہ گر چاہتا ہوں
جس کے ذروں میں ہو عکسِ منزل میں وہی رہ گذر چاہتا ہوں
اے امیر اپنے سجدوں کی خاطر یار کا سنگِ در چاہتا ہوں

جناب صدر نے علامہ انور صابری سے درخواست کی کہ وہ اپنی غزل سنائیں۔ علامۂ موصوف کچھ تو "غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ" کی دھن میں اور کچھ تحسین ناشناس سے تنگ آئے ہوئے مائیک کے پاس تشریف لائے۔ اور فرمایا" فنا صاحب کی اس کامیاب غزل کے بعد جس نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو غزل کے حسین الفاظ میں سمو دیا ہے۔ میں اپنی شکل و صورت کو پیش کر رہا ہوں میں نے آپ کا ذوق پہچان لیا ہے۔ پہلے دو شعر آپ کے ذوق کے لئے عرض کرتا ہوں

ذکر سنتے ہی میرا عتاب آ گیا
خط پہنچنے نہ پایا جواب آ گیا

مولانا کی توقع کے مطابق انہی شعر پر خوب داد ملی۔

ﭖ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "آپ میں سمجھانے
ﭖ کو اچھی طرح سے؟ پھر فنا صاحب کو خطاب
رتے ہوئے کہا "بھائی فنا"

شد اللہ کرامات پیرِ مغاں لب واعظ پہ ذکرِ شراب ہوگیا

پھر آپ نے فرمایا آپ دیکھئے یہ تو آپ کی بات
تھی۔ اب میرے دل کی بات سُن لیجئے۔

کبھی فلک پہ کبھی بر سرِ زمیں پہنچے،
جہاں سنی تری آواز ہم وہیں پہنچے
وہی وہی نظر آتی ہے اب بھی تاریکی
جہاں جہاں ترے نقشِ قدم نہیں پہنچے

اس عارفانہ شعر پر ارباب ذوق نے خوب
داد دی۔ پھر مولانا نے غزل پڑھنی شروع کی۔

جہاں جہاں ترے نقشِ قدم نظر آئے
جبینِ شوق لئے ہم وہیں وہیں پہنچے
بنے تھے راہِ محبت میں ہم سفر لاکھوں
تری تلاش میں تجھ تک فقط ہمیں پہنچے۔
فروغِ لالہ و گل ہو کہ مہر و ماہ و نجوم
کہاں نہ بن کے وہ پیغمبرِ حسیں پہنچے

علامہ نے غزل ختم کی لوگ ہنوز شعراء کا کلام
سننے کے لئے آمادہ تھے۔ ہر طرف سے درخواستیں
ہو رہی تھیں۔ مگر مزاج شناس صدر نے کئی مصلحتوں
کو پیش نظر رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا:
"حضرات! اب ایک بج رہا ہے۔ شعرائے
کرام نے جو مہربانی فرمائی ہے اس کے ہم بہت
ممنون ہیں۔ چونکہ کل دوبارہ یہ محفل منعقد
ہونے والی ہے۔ اس واسطے میں سمجھتا ہوں
کہ اب مشاعرے کے اختتام کا اعلان کیا جائے۔
آپ سب کا شکریہ"۔ صدر کے اعلان کے بعد
محفل مشاعرہ برخاست ہوئی۔

دوسری نشست

حسب توقع اس مشاعرہ کی دوسری نشست
پہلے سے بھی زیادہ کامیاب رہی۔ حاضرین کی
تعداد میں کافی اضافہ پایا گیا۔ وقت مقررہ پر
صدر عالی وقار اور شعرائے کرام ڈیئس پر تشریف
فرما ہوئے۔ ٹھیک نو بجے پردہ اٹھا اور تالیوں
کے شور میں صدر محترم مائیک کے سامنے کھڑے
ہوئے۔ "آپ نے فرمایا۔ حضرات میرا فریضہ
آج کچھ اور نازک تر ہے۔ کل میرا فریضہ بحیثیت
صدر خیر مقدم ادا کرنے کا تھا اور آج اظہار تشکر
و امتنان مقصود ہے۔ مشاعرے حقیقت میں
مختلف انداز کے ہو سکتے ہیں۔ بحمد اللہ ہمارا گذشتہ
شب کا مشاعرہ بہت حد تک کامیاب رہا۔ آج
آپ سے دو تین درخواستیں ہیں۔ اگر آپ اس
کی طرف توجہ فرمائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ
مشاعرہ اور بھی زیادہ کامیاب ہوگا۔ میں اس
امر سے بخوبی واقف ہوں کہ مختلف قسم کے مذاق
کے لئے مختلف ادبی چاشنیاں فراہم کئے جائیں
اور جہاں تک ممکن ہے اس میں ہم سے کوئی
کوتاہی نہ ہوگی۔ بعض وقت ہم میں سے بعض
جوشیلے اصحاب جو ہدایتیں صدر کو دیا کرتے ہیں
وہ اگر نہ دیں تو مجھے فرمانبی صدارت کی عزت

محسوس ہوگی ورنہ میں یہ سمجھوں گا کہ ہر آن مجھے آپ ہی کی ہدایت کا منتظر رہنا ہے۔ اگر آپ مجھ پر چھوڑ دیں تو میرا خیال ہے کہ میں اپنے فریضہ کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کروں گا"

پھر آپ نے ارشاد فرمایا۔ "گرمیٔ مشاعرہ کی علامتیں مختلف ہوا کرتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جہاں ضبط کے ساتھ گرمیٔ محفل کے آثار ظاہر ہوتے ہیں وہی گرمی مشاعرے کے مزاج کے مطابق ہوتی ہے۔ جس طرح شعر کہنا آرٹ ہے بالکل اسی طرح شعر سے لطف اندوز ہونا بھی آرٹ ہے۔ شاعر کا مزاج رگ گل سے بھی زیادہ نازک تر اور اس کے اشعار پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے زیادہ خوشتر ہوا کرتے ہیں۔ ان لطافتوں سے لطف اندوز ہونے والے کو بھی چاہئے کہ وہ اپنی طبیعت میں لطافت اور نفاست کے عنصر کو غالب رکھے۔ اگر شعرائے کرام برا نہ مانیں تو میں ایک تشبیہ دوں گا۔ تشبیہ یہ ہے کہ یہ حضرات شہد کی مکھیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شہد کی مکھی مختلف پھولوں سے رس جمع کر کے وہ چیز پیش کرتی ہے جس کو اگر دنیا بھر کے حکما، سائنسدان اور اطبا مل کر تخلیق کرنا چاہیں تو وہ خلق نہیں ہو سکتی۔ یہ تو قدرت صرف شہد کی مکھی کو حاصل ہے۔ شاعر کے شعر بھی گویا اس قسم کی تخلیق کے ہوتے ہیں۔ ان کے شعر کی تخلیق کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ سنائیں گویا بلبل چہک جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں نہ مبالغہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی یہ بات ایک بڑی حد تک صحیح ہے۔ ایسی صورت میں ہم کو چاہئے کہ ہم نہایت غور سے ان کا کلام سنیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ شعر کے گرانمایہ کلام سے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ دل کی دھڑکن تو ایک طرف شبنم کی چھاتی دھڑکتی ہے اور پھولوں کے پسینے آتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس گلستان ادب سے کچھ پھولوں کو چن لیں اور ان کی مٹھاس اور خوشبو سے فائدہ اٹھائیں یہی میری درخواست ہے۔

ڈاکٹر صاحب قبلہ نے تقریر کو جاری رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ "اب میرا دوسرا خوشگوار فریضہ یہ ہے کہ میں شعرائے کرام کا شکریہ ادا کروں۔ مشاعرے کو نثر پر ختم کرنا میں بڑی بدتمیزی اور بدذوقی سمجھتا ہوں۔ اس لئے میں قبل از وقت ہی شعرائے کرام کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان حضرات کا دور دراز مقامات سے تشریف لانا اور ہم سب کو شاد کرنا حقیقت میں اردو کے لئے اس علاقہ میں پیغام حیات ہے اور یہ پیغام حیات اس زمانے میں جبکہ فضا ناسازگار ہو بہت بڑا اثر رکھتا ہے مجھے امید ہے کہ یہ ہمارے مہمان ہماری کوتاہیوں کو نظر انداز فرمائیں گے۔ سفر میں اور یہاں رہنے میں انہیں جو تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں جنہیں درگذر کرتے ہوئے ہمارے ہدیۂ تشکر کو قبول فرمائیں گے میں دوبارہ آپ سب حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے جس انداز سے اس مشاعرہ کا

رنگ گل باقی رکھا تھا اس سے کچھ میرا اپنا سر بھی
بلند ہو گیا ان میں اس گردن فرازی کو سمجھتا ہوں
کہ آپ کے طفیل میں ہے۔ آپ ہی کی وجہ سے
ہے۔ آپ کا بھی دلی شکریہ ادا کرتا ہوں"

صدرِ محترم نے تقریر ختم کی خاموشی کا طلسم
ٹوٹا، تالیوں کا شور بلند ہوا۔ آپ اپنی نشستِ
خاص پر جلوہ افروز ہوئے اور سامنے کی مائیک
سے اعلان فرمایا۔ ناخدائے سخن حضرت نوح
ناروی یادگار جانشین حضرتِ داغ دہلوی جو
طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے ہماری دعوت
پر تشریف لا نہ سکے انہوں نے ایک غزل بھیجی
ہے جس کو ہمارے مدراس کے نوجوان شاعر جناب
محبوب پاشاہ محبوب پڑھ کر سنائیں گے۔

اس اعلان کے بعد جناب محبوب مائیک کے
سامنے آئے اور..... بحرِ ادب میں ناخدائے سخن
کی کشتی رانی کا منظر پیش فرمایا۔ غزل کیا تھی
گویا ایک جادو تھا جو لوگوں کو مسحور کر رہا تھا۔ ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ زبان کی ساری لطافتیں اس
تنگنائے غزل میں جمع کر دی گئی ہیں آپ بھی اس
کو سنیں اور محظوظ ہوں۔

یوں تو ہر شوخ ادا مرکزِ رعنائی ہے!!
دونوں ہاتھوں سے جو لوٹے تری انگڑائی ہے
رازِ دل کہنے کو لب تک جو فغاں آئی ہے
یہ تری یاد میں پہلی مری رسوائی ہے
مژدۂ موسمِ گل مجھ سے چھپے کیا ممکن
کوئی یہ کان میں کہہ دیگا بہار آئی ہے۔

خندۂ گل سے کبھی ہم متاثر نہ ہوئے
جب ہنسایا ہے تمہیں نے تو ہنسی آئی ہے
وعدۂ روزِ جزا کو بھی ترے دیکھ لیا
آج سے خاتمۂ صبر و شکیبائی ہے!
پھر وہی طور وہی پردہ وہی جلوۂ حسن
کس قیامت کی یہ تجدیدِ خود آرائی ہے
پھر مجھے لوگ لئے جاتے ہیں زنداں کی طرف
یہ نہیں صاف بتاتے کہ بہار آئی ہے

محبوب پاشاہ صاحب نے یہ غزل ختم کی تو
جناب صدر نے مولوی مرزا عباس علی صاحب
عباس سے .. زحمت فرمانے کی درخواست کی۔
آپ نے ایک نظم سنائی۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم
یہ نظم ریکارڈ کر نہ سکے۔ آپ کے بعد جناب بجے تر تھ
دلگیر کڈپوی نے اپنا کلام سنایا پھر جناب نذیر بنارسی
سے کلام سنانے کی درخواست کی گئی۔ انہوں نے
تین رباعیاں اور ایک غزل سنائی۔ رباعیاں ملاحظہ
ہوں۔

(۱) للہ مری سوزش پیہم کو نہ چھیڑ
جا راہ لے اپنی تپشِ غم کو نہ چھیڑ
میں نے تری جنت کو کبھی چھیڑا ہے؟
تو بھی مرے خاموش جہنم کو نہ چھیڑ

(۲) ہر سانس میں اک حشر بپا ہے واعظ
دنیا میں بھی عقبیٰ کا مزہ ہے واعظ
آئے ہو تم اک روزِ جزا کو لے کر
ہر روز یہاں روزِ جزا ہے واعظ

(۴) رخصت ابھی ظلمتوں کا ڈیرا کر دوں
تاپید جہان سے اندھیرا کر دوں
سورج کے نکلنے میں تو ہے دیر ابھی
پیالہ نہ اٹھادوں تو سویرا کر دوں

پھر نذیر صاحب نے ارشاد فرمایا "ایک غزل سنانے کی فرمائش کی گئی ہے۔ پیش کرتا ہوں شاید آپ کو بھی پسند آئے۔"

سردیٔ صلح بھی ہے گرمیٔ پیکار بھی ہے۔
زندگی دھار بھی چلتی ہوئی تلوار بھی ہے
جس کو جینا ہے تلاطم سے کنارا نہ کرے
اب جو طوفاں ہے تو اس بار بھی اس پار بھی ہے
شاہد بزم فقط بزم نہیں تیرے لئے
رقص کرنے کے لئے عرصۂ پیکار بھی ہے

پھر نذیر صاحب نے کہا "خاص طور پر ملاحظہ ہو"

سازکے تار ذرا پھر سے ملالے مطرب
اس میں کچھ ٹوٹے ہوئے تار کی جھنکار بھی ہے
کچھ نہیں صرف محبت ہے وفا کی قیمت
سر تو حاضر ہے مگر کوئی خریدار بھی ہے
زہر کے گھونٹ نذیر اب نہ پیے جائینگے
کیونکہ آزاد ہیں ہم جرأت انکار بھی ہے

مقطع پر نذیر صاحب کو خوب داد ملی۔ ہمیں اس کا افسوس ہے کہ غزل میں اور بھی اشعار قابل داد تھے مگر وہ فضا میں یونہی کھو گئے۔ آپ کے بعد جناب کوثر نیلوری مدرس مسلم ہائی اسکول کڑپہ کے سنانے کی باری آئی۔ یہ نوجوان شاعر خوب کہتے ہیں اور ترنم سے سناتے ہیں۔ مگر اس مشاعرہ میں کچھ اس طرح مرعوب نظر آئے کہ آواز بے سُرا ہوگئی اور کچھ الفاظ بھی حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ اس وقت ہمیں آپ کی غزل کا مطلع یاد ہے جو عرض کئے دیتے ہیں۔ مطلع واقعی بہت خوب ہے۔

یہ پاش پاش سبو یہ شکستہ پیمانے
سنا رہے ہیں مری تشنگی کے افسانے

جناب کوثر کے بعد جناب نامر کرنولی مائیک کے قریب آئے۔ یہ شہر کرنول کے نوجوان شاعر ہیں۔ ان کا تعارف پچھلے مشاعروں کی روداد میں بہت ہوچکا ہے۔ ہم اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ نامر صاحب کا کلام خدا کے فضل سے نکھرتا جارہا ہے۔ غزل ترنم سے سناتے ہیں اور خوب سناتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ ذرا مائیک سے ہٹ کر سنائیں تو آواز اور زیادہ مرغوب ہوجائے گی۔ جب کلام سناتے ہیں تو دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا مائیک کے بوسے لے رہے ہیں۔ غزل ملاحظہ ہو۔

آرزو دل کی کچھ اس طرح نکھر آئی ہے۔
زندگی آہوں میں اشکوں میں نظر آئی ہے

حسن مطلع سنانے سے پہلے نامر صاحب نے فرمایا۔ "ایک سفر سے متاثر ہوکر میں نے یہ شعر کہا ہے"۔ واقعی یہ شعر بتا رہا ہے کہ آپ کا سفر نہایت ہی حسین ہوا ہوگا۔

یوں مرے دل میں تری یاد سفر آئی ہے
جیسے اک برق نشیمن میں اتر آئی ہے
میں بھی کیا ناز ہوں جس کیلئے ساغر لے کر
عرش سے رحمت حق خود ہی اتر آئی ہے

رقص کرتے ہیں نگاہوں میں اندھیرے ہر سُو
وائے مجبوری کہ کہتا ہوں سحر آئی ہے

یہ شعر واقعی بہت اچھا ہے مگر افسوس کہ محفل میں بہت کم لوگ اس کی رمزی کیفیت سے آگاہ ہو سکے۔

عہدِ ماضی کے وہ پُر کیف مناظر تو بہ
یاد بھی صورتِ خونابۂ تر آئی ہے۔
ہم جدائی میں بھی ناصر نہ ہوئے ان سے جدا
وہ نہ آئیں نہ سہی یاد مگر آئی ہے۔

ناصر صاحب نے غزل ختم کی تو جناب سلیمان اریب صاحب تشریف لائے اور غزل پیش کی۔

آنکھوں پہ الزام بہت ہیں، طور بہت ہیں، بام بہت ہیں
کس کس ڈر سے بچ نکلو گے، کوچہ کوچہ دام بہت ہیں
لب پر آہیں، سینے خالی، ایسے عاشق عام بہت ہیں
تیری خوشی سے سب کی خوشی تک عشق میں تیرے کام بہت ہیں
تشنہ لبی قسمت تو نہیں ہے، میخانے میں جام بہت ہیں
پینا ویسے جرم نہیں ہے لیکن ہم بدنام بہت ہیں۔

جناب سلیمان اریب کے بعد جناب حیدر علی خاں صاحب حیدر اسسٹنٹ پروفیسر، پریسیڈنسی کالج مدراس نے کلام سُنایا۔ پہلے ایک قطعہ پیش کیا

اف! مقدر ہی پھوٹ جاتے ہیں
حوصلے اپنے چھوٹ جاتے ہیں
ان کے جو بن پہ بل جو آتا ہے
دل کے سب تار ٹوٹ جاتے ہیں

اس کے بعد ایک غزل سنائی جس کے کچھ شعر درج ذیل ہیں۔

کیوں پیش نظر جلوہ گہِ ناز نہیں ہے
کیا عشق مرا صاحبِ اعجاز نہیں ہے؟
اس آہ سے ڈرتے رہو اربابِ زمانہ
جس آہ میں کہنے کو بھی آواز نہیں ہے
دل حکمت صیاد پہ کیوں ہو نہ تصدق
رکھ چھوڑے ہیں پر طاقتِ پرواز نہیں ہے

جناب حیدر صاحب کے بعد جناب گوہر دہلوی تشریف فرما ہوئے۔ گوہر صاحب نے پچھلے دن کی طرح اپنے استادِ قبلہ کے دو شعر سنا کر اپنا کلام سنایا۔ ان دو اشعار میں ہم پہلا شعر سُن نہ سکے دوسرا نذر ناظرین کیا جاتا ہے۔

ہم سے بھی کبھی ربط تھا آنکھیں تو ملا
او وقت کے ساتھ روٹھ جانے والے

پھر گوہر صاحب نے ایک قطعہ سنایا

قیامت تک بھی ہم مٹنے نہ دیں گے اپنی اردو کو
تعصب کیا مٹا سکتا ہے اس کی رنگ و خوشبو کو
یہ ہے اک عہدِ واثق متفق ہیں اس پہ اے گوہر
یہ پیاری ہے سکھ، عیسائی کو مسلم کو ہندو کو

پھر دو قطعے اور سنائے اور اس کے بعد ایک غزل سنائی ہم یہ پوری غزل نقل نہ کر سکے۔ کچھ اشعار پیش کر رہے ہیں ملاحظہ ہو۔

تمہاری الفت نے مسکرا کے ہاں کسی کے دل کا قرار چھینا
سکون دن کو نہ چین شب کو لبوں پہ اب بھی فغاں ہو گی
ادھر ہے یہ شورشِ جوانی اُدھر ہیں یہ ملتفت نگاہیں
ازل سے جب ہے یاس کی قسمت تباہیِ دل کہاں نہ ہوگی

گوہر صاحب نے ارشاد فرمایا" ایک سیاسی شعر ہے
وہ بھی عرض کرتا ہوں"

ہمیں ہیں امن واماں کے بانی ہمیں سے قائم ہے زندگانی
ہمارا حصہ ہے رہنمائی نصیب ہر کارواں نہ ہوگی

اس شعر پر خوب واہ واہ ہوئی۔ گوہر صاحب سے یہ
شعر بار بار پڑھوایا گیا۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا:۔

کہیں چھپانے سے چھپ سکا ہے یہ راز ہمدم ہے راز الفت
حدود باندھیں ہزار لیکن یہ بات دل میں نہاں نہ ہوگی
یہ کاروبار جنوں ہے گوہر یہیں نفع وضرر نہ ہوگا
یہ زندگانی ہے عاشقانہ اسیر سود وزیاں نہ ہوگی

جناب گوہر کے بعد جناب شاہد سے کلام سنانے کی
درخواست کی گئی آپ نے غزل سنائی:

آدمی کی نظروں میں اک نیا اجالا ہے
آدمی اندھیروں پر فتح پانے والا ہے
زندگی کے خالق ہم زندگی کے مالک ہم
ہم نے اپنے سانچوں میں زندگی کو ڈھالا ہے
جو چھپا کے رکھی ہے لا وہ ساری مے ساقی
ورنہ آج رندوں کو ہوش آنے والا ہے
ہو نہ صبح کا دھوکا لوگ سب سمجھتے ہیں
کس قدر اندھیرا تھا کس قدر اجالا ہے
رات کے گذرتے ہی اور ایک رات آئی
آپ تو یہ کہتے تھے دن نکلنے والا ہے

افسوس ہے کہ جناب شاہد کی اس کامیاب غزل
کی بھی جیسی کہ داد ملنی چاہئے تھی نہ ملی۔ صدر محترم
نے جناب ضیا فتح آبادی سے کلام سنانے کی درخواست
کی۔ آپ نے غزل سنائی۔

شام غم ہے کیا سکون وخواب کی باتیں کریں
چاند تاروں سے دل بیتاب کی باتیں کریں
پی نہیں سکتے تو ہے کیا جرم ذکر نائے و نوش
ساقیٔ مست وشراب ناب کی باتیں کریں
جو رواں ہے منزل مقصود کی جانب مدام
اس مچلتی گاتی موج آب کی باتیں کریں
داستان شمع و پروانہ تو شب بھر کہہ چکے
صبح دم خورشید عالم تاب کی باتیں کریں
پا لیا ہم نے ضیا راز فریب آرزو
غم سہی پھر عشرت نایاب کی باتیں کریں

ضیا صاحب کے بعد جناب ستیش ساحر گورکھپوری
کے پڑھنے کی باری آئی۔ آپ نے ایک قطعہ پیش کیا

کبھی جو حرف شکایت زباں پہ لا نہ سکے
نظر کی چوٹ سہی اور دل ملا نہ سکے
ہنسی لبوں پہ ہے صرف اس لئے کہ اے ساحر
کبھی کبھی جو زمانہ کے غم اٹھا نہ سکے۔

آپ نے ایک اور قطعہ سنایا اور غزل پیش کی۔

احساس ہی اک لمحہ دامن کش درماں تھا
جب حسن ہوا مائل خود عشق گریزاں تھا
ناصح مجھے ساقی نے دو گھونٹ پلا دی ہے
نظروں کا اشارہ ہی غارت گر ایماں تھا
ٹکرائی نظر ان سے جب پہلے پہل ساحر
کچھ وہ بھی تھے گھبرائے کچھ میں بھی پریشاں تھا

جناب ساحر کے بعد جناب سعید ولایت اللہ صاحب
اشرف نے ایک تاریخی قطعہ سمینار کی کارروائیوں
سے متعلق صدر کی خدمت میں پیش کیا۔ قطعہ یہ

کرنے سے پہلے قاضی صاحب نے بہ اجازت صدر اس کے تین یا چار شعر متعلق مشاعرہ پڑھ کر سنائے۔

جناب آشرف کے بعد جناب ابوالجلال صاحب ندوی نے اپنا کلام سنایا۔ آپ ایک زمانے سے مدراس میں مقیم ہیں۔ شعر گوئی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں فرماتے پھر بھی جب کبھی کہتے ہیں خوب کہتے ہیں۔ ایک قطعہ پیش کیا جو حاضرین کی دلچسپی کا باعث ہوا۔ مولانا کو خوب داد ملی۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

ایک قطرہ ان کی آنکھوں سے گرا
ایک عالم زیر و بالا ہوگیا
میری آنکھوں میں اندھیرا چھاگیا
چہرۂ خورشید کالا ہوگیا
پھر ذرا وہ مسکرانے سے لگے
چھٹ گیا بادل اجالا ہوگیا

جناب ندوی کے بعد جناب شاداں نے غزل پیش کی۔ آپ مدراس کے معمر کہنہ مشق شاعروں میں سے ہیں۔ غزل قدیم رنگ میں خوب کہتے ہیں آپ بھی کچھ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

دل میں ہے درد لب پہ زاری ہے
کب غم عشق اختیاری ہے
اڑ رہا ہوں غبارِ رہ بن کر
اوج پر میری خاکساری ہے
گردشیں بے سبب نہیں آتیں
کچھ نہ کچھ وجہ بے قراری ہے
تیرا عاشق کہاں سنبھالا لے
تیغ ابرو کا زخم کاری ہے
مغفرت کا سبب بنی شاداں
واہ کیا قدرِ خاکساری ہے

انور صابری، انور صابری کی آوازیں بلند ہوئیں صدرِ محترم نے زیرلب مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا "اردو سیمینار کے احباب فرماتے ہیں کہ ہم نے بہت صبر کیا۔ حضرت انور صابری کو اب تکلیف دی جائے" حضرت انور صابری مستانہ وار مائیک کے سامنے تشریف فرما ہوئے۔ چہرے سے کچھ برہمی سی ظاہر ہو رہی تھی۔ ہم نے بارہا یہ محسوس کیا ہے کہ مولانا جب کبھی برہم ہوتے ہیں آپ کا رنگ اور زیادہ دلاویز ہو جاتا ہے۔ نہیں معلوم کس نے مولانا کو اپنے تیرِ زبان کا نشانہ بنایا تھا بہرحال . . اس کرم سے تو مشاعرے میں کافی گرمی آگئی۔ حسب العادت آپ نے تمہیداً ایک دو جملے کہے۔ "حضرات اس مشاعرہ میں مجھ سے زیادہ سن رسیدہ بزرگ اپنے اپنے کمالاتِ فن دکھا گئے اب میں آپ کا کمالِ فن دکھا رہا ہوں۔ پھر اپنے سحر انگیز ترنم میں ایک قطعہ پیش کیا۔

وہ قدرِ سخن مدراس میں ہے، وہ عظمتِ فن مدراس میں ہے

پھر ڈرامائی طور پر رک گئے، اِدھر اُدھر دیکھا اور ارشاد فرمایا۔ "یہ شعر نذر کر رہا ہوں۔

محسوس یہ ہوتا ہے جیسے غالب کا وطن مدراس میں ہے

اس شعر پر خوب داد ملی مگر ہم تو یہی کہیں گے کہ مولانا نے بے حد فیاضی سے کام لیا ہے۔ لوگوں کی داد پر مولانا مسکرا مسکرا کر "مہربانی" کہتے ہوئے سلام کرنے لگے۔ پھر فرمایا "غنیمت ہے کہ آپ نے ایک ڈاڑھی

کی لاج رکھ لی۔ شعر دوبارہ ارشاد فرمانے کی خواہش
ہر طرف سے ہونے لگی تھی۔ پھر مولانا نے کمال
مہربانی سے اس کو دوبارہ پڑھ کر سنایا اور فرمایا
کہ شعر سنئے کچھ اشارے ہیں۔

ہے موج بحاری میں روشن خورشید جلال حق
تو ہر جمال شعر و ادب یوں جلوہ فگن مدراس میں ہے

پھر تمہیداً ارشاد ہوا۔ "ایک شعر خدا معلوم کیوں
عرض کر رہا ہوں۔ غالباً پنجاب کا مشاہدہ ہے۔

انکار کی رنجش شاعروں پر ہیں خندہ بہ لب گلہائے غزل
واللہ بہاروں پر انور اردو کا چمن مدراس میں ہے

"اور مجھے کہنے کی اجازت دیجئے" مولانا کی تمہید
پھر جاری ہوئی۔ "دکن میں اردو شروع ہوئی
شمالی ہند تک پہنچی جب وہاں مخالف قوتوں سے
تنگ آنے لگی تو پھر اپنے خاندان کی طرف لوٹ آئی"
پھر فرمایا غزل کے چند شعر سنئے"

سر بسجدہ ہے سارا زمانہ اللہ اللہ ترا آستانہ
ذکر سن کر ترا غائبانہ رک گیا چلتے چلتے زمانہ
تیرے ہر نقش رہ داد عزم سے بن گیا ایک دلکش فسانہ
عشق کی ہر نظر مرغ بسمل حسن کی ہر ادا قاتلانہ
بات میں حسن ایمان واعظ چال میں فطرت کافرانہ
ہائے وہ ہلکا ہلکا تبسم . . . .

اس مصرعہ پر کسی نے آہ کی۔ مولانا نے فرمایا
"مجھے آپ کے دل کی چوٹ محسوس ہوئی" اور پھر
ارشاد ہوا۔

ہائے وہ ہلکا ہلکا تبسم قدرتی بجلیوں کا خزانہ
کھینچ لیتا ہوا نظروں سے جلوے میری نظروں سے ٹکرا نہ جانا

علامہ انور صابری کے بعد صدر محترم نے جناب
فنا نظامی سے کلام سنانے کی درخواست کی۔ آپ
بھی کچھ برہم سے نظر آئے اور آپ نے بھی تمہید کے
ساتھ غزل شروع کی۔ "حضرات میں صرف غزل گو
ہوں میں قصیدہ گو نہیں۔ میں نہ مرثیہ کہتا ہوں
نہ قصیدہ کہہ سکتا ہوں۔" فوراً انور صابری قبلہ کی
آواز فضا میں گرجنے لگی۔ "لیکن اظہار واقعہ کوئی
جرم نہیں ہے مولانا" فنا صاحب نے کمال
انکساری کے ساتھ فرمایا "حضرت میں آپ کی
طرف اشارہ نہیں کر رہا ہوں۔ میں صرف غزل
ہی کہتا ہوں اور غزل ہی پیش کروں گا" اب
فنا صاحب نے بات بڑھانی خلاف مصلحت جان
کر غزل شروع کر دی۔

دل مضطرب نہ دہرا غم عشق کا فسانہ
کہیں جاگ اٹھے نہ دنیا کہیں سن نہ لے زمانہ

پھر فرمایا ایک سیاسی اشارہ ہے شعر ملاحظہ ہو۔

ہے یہاں بھی آب و دانہ ہے وہاں بھی آب و دانہ
ہو سکون دل میسر تو قفس بھی آشیانہ

یہ شعر مجمع کے لئے بڑا ولولہ انگیز ثابت ہوا۔ فنا صاحب
نے حاضرین کی خواہش پر اس کو بار بار سنایا۔

ذرا اے خیال جاناں کوئی اور تازیانہ
تجھے چھین لے نہ مجھ سے کہیں گردش زمانہ
ترے پاس تیرا غم ہے ترے پاس میرا دل ہے
مرے ساتھ ہے حقیقت ترے پاس ہے فسانہ

جناب فنا صاحب اس شعر پر پہنچے تو ہم بھی سوچنے
لگے کہ بھئی واہ! غزل گوئی کے کیا جوہر دکھائے ہیں

مری ٹھوکروں میں دنیا مری لغزشوں میں جنت
تری سمت اٹھ رہے ہیں مرے پاؤں والہانہ

نہ سکوں ہے بتکدہ میں نہ قرار ہے حرم میں
کہاں جائیں غم کے مارے جو نہ ہو شراب خانہ

محفل میں سے کسی کی آواز آئی۔ "مبارک ہو" فنا صاحب نے فرمایا۔ "میں شراب خانہ کی تعریف کل کرچکا ہوں۔" غالباً مولانا اپنے اس مصرع کی طرف اشارہ فرما رہے تھے جس میں ذکر تھا کہ آپ اصطلاحاً شراب پیتے ہیں۔ بہرحال آپ فوراً فرمانے لگے۔ "آخری شعر ہے شاید کسی قابل ہو۔"

ترے حسن منفعل کا مجھے ہر ستم گوارا
مری عشق کی طبیعت ہے اگرچہ باغیانہ

اسی ایک آس پر میں قفس میں جی رہا ہوں
کبھی اے فنا بنے گا یہی میرا آشیانہ

جناب فنا صاحب کے بعد نذیر صاحب نے مومن مرحوم کی مشہور زمین میں ایک غزل سنائی۔ کچھ شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

ہوئے مجھ سے جس گھڑی تم جدا
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
مری ہر نظر تھی اک التجا
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ تمہارا کہنا کہ جائیں گے | اگر آسکے تو پھر آئیں گے
اسے اک زمانہ گذر گیا | تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
مرے گرم گرم سے اشک میں | مری سرد سرد سی آہ میں
مرا ٹوٹا ٹوٹا سا آسرا | تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہیں تم کو جانا ہوا اگر
نہ گئے بغیر نذیر کے

وہ زمانہ اپنے نذیر کا
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جناب نذیر کے بعد صدرِ محترم نے نواب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی کی عطا کردہ غزل جناب ناصر کرنولی سے پڑھوائی۔ حضرت اثر نے غزل بھیج کر اس مشاعرہ پر بڑی عنایت فرمائی وہ غزل بھی ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

گذشتہ عیش کے ہم ہیں امیدوار ابھی
پلٹ کے آئے گا جیسے وہ روزگار ابھی
چمن سے گل ہوئے رخصت گلوں سے نکہت و رنگ
سجی گئی بھی نہ تھی محفلِ بہار ابھی
تجھے خبر نہیں کہتے ہیں سرخوشی کس کو
کہ تیرا تشنہ ہے زحمت کشِ خمار ابھی
سراب ہو چکی ثابت ہزار بار مگر
وہی ہیں ہم وہی منزل کا اعتبار ابھی
یہ کون وحشی لغزش خرام گذرا ہے
کہ محوِ رقص ہے صحرا میں کچھ غبار ابھی
اثر خیال جمل میں ہم خاک ہو گئے!
وہ خوشگوار ابھی ہے یہ ناگوار ابھی

صدرِ محترم نے جناب ناوک سے کلام سنانے کی درخواست کی۔ انھوں نے دو یا تین قطعے سنائے جو نہایت ہی مقبول رہے۔ پھر ایک غزل سنائی۔

جناب شوق بہرائچی، جناب اسیر دہلوی، مولوی سید سلطان محی الدین صاحب بہمنی اور جناب فنا مدراسی نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ پھر جناب شاہد صدیقی کو زحمت دی گئی انہوں نے اپنی وہ مشہور غزل سنائی جو اکثر رسالوں میں چھپ گئی ہے۔ ہم صرف اس کا

مطلع پیش کئے دیتے ہیں۔

سفینوں کے دامن میں انقلاب پلتے ہیں
بیکشوں کی لغزش سے میکدے سنبھلتے ہیں

شاہد صاحب کے بعد جناب آجل مدراسی، جناب سیش ساحر گورکھپوری جناب حیات پاشاہ مدراسی نے اپنا اپنا کلام پیش فرمایا۔ جناب حیات مدراسی کے تین شعر جو ہمیں پسند آئے اس موقع پر عرض کئے دیتے ہیں۔

ابھی ہم کو مر مر کے جینا پڑے گا
ابھی حادثات جہاں اور بھی ہیں
ہمیں صرف تم سے شکایت نہیں ہے
تمہاری طرح مہرباں اور بھی ہیں
حیات آسماں پر کمندیں نہ پھینکو
ابھی بستیوں میں جہاں اور بھی ہیں

حیات صاحب نے جب اپنی غزل ختم کی تو انور صابری قبلہ مائیک کے پاس آئے اور پھر ہنگامہ آرائی ہونے لگی۔ سابق شعراء سے کسی صاحب نے تمہیداً ارشاد فرمایا تھا کہ میں قصیدہ گو نہیں ہوں غزل کہتا ہوں" اسی لئے انور صابری قبلہ نے فی البدیہہ ایک شعر موزوں فرماکر حاضرین کو سنایا۔ شعراء کے نرم و نازک اور لطیف تنازعات سے بھلا محفل کیا متاثر ہو سکتی ہے مگر ان کے کلام کی گرمی سے واقعی سامعین بے حد محظوظ ہو رہے تھے چنانچہ وہ شعر ملاحظہ فرمایئے۔

اردو کے محافظ ہیں ان کے لئے قصیدہ پڑھتا ہوں
مدراس سکے رہنے والوں کے یوں حق میں قصیدہ پڑھتا ہوں

پھر ایک قطعہ سنایا

تیرے ہوتے غم آشوب زماں لے ساقی!
ہے تری عزت خود دار کہاں اے ساقی؟
جس کی شیرینی گفتار یہ دل کھنچتے تھے
کھنچنے والی ہے دہن سے وہ زباں اے ساقی

صدر محترم کی خواہش پر انور صابری قبلہ نے اپنی دو پرانی غزلیں سنائیں جن سے حاضرین بھی بیحد محظوظ ہوئے پہلی غزل یہ تھی۔

یہ مانا میرے دم سے میکدہ بدنام ہے ساقی
مری فطرت بدل دینا بھی تیرا کام ہے ساقی
ہمیں طوفاں کی موجوں میں بھی ساحل یاد آتا ہے
ہمارا ذوق بربادی ابھی کچھ خام ہے ساقی
تری مستی بھری آنکھوں کو کوئی کچھ نہیں کہتا
یہ انور صابری کم بخت کیوں بدنام ہے ساقی

دوسری غزل بھی بہت قدیم ہے۔

اب بھی یہ تعلق باقی ہے اب بھی وہ کرم فرماتے ہیں
جب کوئی خبر سن لیتے ہیں پرسش کے لئے آجاتے ہیں
وہ آخری شب چپکے چپکے جب یاد مجھے فرماتے ہیں
شبنم کی دھڑکتی ہے چھاتی تاروں کے پسینے آتے ہیں
بے نام و نشاں سی اک آہٹ محسوس تو اکثر ہوتی ہے
آنکھوں کے دریچوں سے دل میں شاید ہی آتے جاتے ہیں

"شاید وہی آتے جاتے ہیں" کہتے ہوئے مولانا اپنے ہاتھ کو کچھ اس طرح جنبش میں لاتے ہیں کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ واقعی کوئی چھپ کر آیا اور چلا گیا۔

علامہ نے غزل ختم کی، تالیوں کا شور ہنوز جاری تھا۔ مولوی عبدالباری صاحب حاوی آگے بڑھے اپنا تاریخی قطعہ سنانے لگے۔ ہم پہلا شعر سن ہی نہ

یہ ملے سے اردو سیمینار کی سعادت ہے
میسر اس کو ہے ہر وقت فیضِ حقانی
جلال تیری جلالت کی یہ علامت ہے
کہ تیری خدمت اردو ہے مانی اور جانی
کہا ہے خوب یہ حادی نے از لبِ بہجت
مشاعرہ ہے عدیم المثال و لاثانی

صدرِ محترم نے محفل کے تیور دیکھ لئے کہ لوگ فنا صاحب سے پھر غزل سننا چاہتے ہیں۔ اس لئے آپ نے فنا صاحب کے نام کا اعلان فرمایا۔ محفل نے تالیوں کے شور کے ساتھ اس اعلان کا استقبال فرمایا۔ فنا صاحب تشریف فرما ہوئے۔ چہرے پر خفیف سی برہمی کے آثار اب بھی تھے۔ کھنکار کے گلا صاف کیا اور اپنے لحن داؤدی میں یہ غزل سنانے لگے۔

جب بھی بیٹھا ہوں دامن کو سینے
مجھ کو چھیڑا ہے دیوانگی نے
موجِ طوفاں کو ساحل سمجھ کر
ڈوب جاتے ہیں اکثر سفینے
دعوتِ ضبطِ غم دینے والے
کاش پڑتے تجھے اشک پینے!

اس شعر کو کچھ اس طرح ادا فرمایا کہ معلوم ہوتا تھا۔ واقعی اپنے دل کا درد ظاہر کر رہے ہیں۔ مجمع نے اس سے بہت اثر لیا اور آپ سے یہ شعر بار بار پڑھوایا گیا۔

دل کی دھڑکن ہوئی اس طرح تیز
جیسے مجھ کو پکارا کسی نے
تیرے الطاف نے جو نہ بخشا
دے دیا وہ تری برہمی نے

یہ شعر بھی حاضرین کو بہت پسند آیا۔ کئی طرح کی تلمیحیں اس شعر سے متعلق فرض کرلی گئیں۔ اس لئے محفل نے کئی بار یہ شعر فنا صاحب سے سنا آخر فنا صاحب کچھ اور سنا کر تشریف بر بیٹھ

اے فنا صورتِ غم نہ بدلی
کروٹیں لیں بہت زندگی نے

پھر ناوک صاحب تشریف فرما ہوئے اور اپنے خاص انداز میں ایک غزل سنائی۔

خوشی میں نوجواں بجاتے تالیاں نکل پڑے
بگڑ گئے تو لے کے کالی جھنڈیاں نکل پڑے
خزاں کا دور تھا تو دُم دبا کے سب کھسک گئے
بہار آئی جب ہزاروں باغباں نکل پڑے
یہ دوستی کے نام سے گلے میں ہاتھ ڈال کے
گلا نہ یوں دباؤ کہ مری زباں نکل پڑے
بڑے بڑے ادیبوں کو تو انقلاب کھا گیا
یہ ناوک آج ایسے وقت میں کہاں نکل پڑے

جناب ناوک نے اور ایک غزل سنائی جو بے حد پسند کی گئی۔ ہم وہ پوری غزل آپ کے ملاحظہ کے لئے پیش کر رہے ہیں۔

تو درِ کعبہ پکڑ وحشی نہ بتخانہ پکڑ!
جا کے دونوں ہاتھ سے دامانِ جانانہ پکڑ
جو قلم کاغذ سے لڑتے ہیں ادیبانہ پکڑ
اس کو کہتے ہیں جہاں والے شریفانہ پکڑ
خالی پیمانے لئے کیوں چیختا ہے بار بار
چھوڑ پیالے کو ریشِ میرِ میخانہ پکڑ

فصلِ آزادی کے دیوانے بھرے ہیں جیل میں
کیا چمن میں یہ بہار آئی ہے دیوانہ پکڑ
اک پیالی چائے پر ہوٹل میں بیٹھے ہیں غزل
پہلواں وہ ہم ہیں جو لڑتے ہیں ایک آنہ پکڑ
وہ تو شہدوں کی طرح دراصل ہی لڑنے لگے
ہم تو ناوک صرف لڑتے تھے ظریفانہ پکڑ

جناب ناوک نے غزل ختم کی تو صدر محترم نے بڑا دل خوش کن اعلان فرمایا، چنانچہ ارشاد ہوا "ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی نے ایک اور غزل بھیجی ہے جس کو میں خود پڑھ کے سنانا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی شوق ہو رہا ہے۔ اثر سے متاثر ہو رہا ہوں اور مجھے خوف ہے کہ کہیں شاعر نہ بن جاؤں۔" محفل میں کافی تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو محامڈن کالج فی الحال گورنمنٹ آرٹس کالج کے گریجویٹ ہیں۔ ان لوگوں کو قدیم ایام پھر سے یاد آگئے۔ جب کہ صدر محترم ڈاکٹر بدیع عربی پروفیسر اور پرنسپل کی حیثیت سے کالج کے مشاعروں کی صدارت فرماتے تھے اور نوجوان طلبا کا دل بڑھانے کے لئے کبھی کبھی خود بھی کلام موزوں فرماکر سنایا کرتے تھے۔ آپ کے پڑھنے کے خاص انداز بھاتے ہیں۔ گو اس وقت کلام حضرت نوح ناروی کا تھا۔ پھر بھی ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ڈاکٹر صاحب کے پڑھنے سے وہ اشعار نورٌ علیٰ نور بن گئے۔

تمنا تھی کہ میرے دل میں وہ تیرِ نظر بیٹھے!
مگر اس گھر سے نفرت ہے تو جا کے اپنے گھر بیٹھے
رہا اپنے بھی گھر میں ہم کو پاس اُن کی اجازت کا
ملے تو پوچھ کر اٹھے جو بیٹھے پوچھ کر بیٹھے

کوئی شکوہ کرے کیوں آگے پیچھے دہنے بائیں کا
جدھر جس کو بٹھا دے میرِ محفل وہ اُدھر بیٹھے
شبِ فرقت ہجومِ رنج و غم میں خبر کس کو
سحر ہونے سے پہلے کیا دلِ بیتاب کر بیٹھے
جگر بیتاب دل مشتاق تم کیا حکم دیتے ہو
اِدھر بیٹھے اُدھر بیٹھے کدھر تیرِ نظر بیٹھے
پریشاں حال اشک آلودہ آنکھیں مضمحل چہرہ
ہمارے سوگ میں تم کیا یہ اپنا حال کر بیٹھے
بہت اچھا ہمارا وقت گزرا ان کی محفل میں
انہیں کو دیکھ کر اٹھے انہیں کو دیکھ کر بیٹھے

جناب نوح کے طوفانِ گریہ کا اثر دیکھا؟
گرے تھے چشمِ تر سے جتنے آنسو اُتنے گھر بیٹھے

ہر شعر پر داد دی جانے لگی۔ اکثر اشعار بار بار پڑھوائے گئے۔ پھر صدرِ محترم نے جناب گوہر دہلوی سے غزل سنانے کی فرمائش کی۔ گوہر صاحب نے غزل سُنائی جس میں روزمرّہ اور محاورے کی چاشنی خوب پائی جاتی ہے۔

نہ ہو برہم نہ ہو برہم نہ چھینو زندگی میری
غلط فہمی سے بگڑی ہے فقط یہ آپ کی میری
یونہی دیوانگی میں ذکر تھا بربادیٔ دل کا
خفا ہو تم یونہی تم سے بھلا کب بات تھی میری
خوشی کیسی کہاں کی شادمانی اب یہ عالم ہے
کہ رہ رہ کر مجھے تڑپا رہی ہے زندگی میری
ابھی دیر و حرم کی منزلِ کہنہ سے گزرا تھا
کہاں لے جا رہی ہے اب مجھے وارفتگی میری
گریباں چاک دامن دھجیاں وحشت خیالوں میں
جنونِ عشق سے دیکھے کوئی وابستگی میری

ادب کیسا کہاں کی خدمت اردو میاں گوہر
تجارت ہی تجارت بن گئی ہے شاعری میری

جناب گوہر کے بعد جناب امیر دہلوی، جناب الفت مدراسی اور جناب شہاب ترجنا پلوی نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ پھر جناب نذیر بنارسی تشریف لائے اور دو رباعیاں سنائیں۔ واقعی پھڑکتی ہوئی رباعیاں تھیں۔

(۱) رنگین کہیں جو زندگانی ہوتی
پھر کاہیکو یہ سادہ بیانی ہوتی
سمجھا لو بزرگو! مگر کیا سمجھوں؟
اے کاش تمہارے بھی جوانی ہوتی

(۲) میخانوں سے جب دور نظر آئے گی
شب آپ کو پُر نور نظر آئے گی
جو آج ہے انگور کی بیٹی زاہد
جنت میں وہی حُور نظر آئے گی

نذیر صاحب نے ایک غزل بھی سنائی جس کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں۔

ہنسنے بھی نہ پائے جی بھر کے ہنسنے کا نتیجہ پا بھی گئے
غنچے کی طرح اس گلشن میں ہم کھِل بھی گئے مرجھا بھی گئے
دے کے سہارا زلفوں کا ہلکا سا تبسم فرما کر
بادل کی طرح سے چھا بھی گئے بجلی کی طرح لہرا بھی گئے
کیوں تم نے نگاہیں نیچی کیں تھے یہ پسینے کیوں آئے
اس ایک نظر میں دو عالم شرما بھی گئے گھبرا بھی گئے
اجڑے ہوئے گھر میں دم بھر کو آئی ہے نذیر ایک رونق سی
ہم ان کے مقصد کے قرباں آئے بھی نہیں اور آ بھی گئے

صدر محترم نے پھر فنا سے غزل سنانے کی درخواست کی۔ جناب فنا نے پہلے ایک قطعہ سنایا۔

آبلہ غم کا پھوٹ جاتا ہے
شیشۂ دل بھی ٹوٹ جاتا ہے
اس سے پوچھو کچھڑنے کی لذت
کارواں سے جو چھوٹ جاتا ہے

قطعہ سنانے کے بعد فنا صاحب نے ایک غزل سنائی

صحنِ حرم و کوئے صنم چھوڑ دیا ہے!
ہر در کو ترے در کی قسم چھوڑ دیا ہے!
سلجھے ہیں نہ سلجھیں گے کہیں گیسوئے دوراں
کچھ ایسا تری زلفوں نے خم چھوڑ دیا ہے
ہر دور سے گذرا ہوں مسرت ہو کہ غم ہو
ہر راہ میں اک نقشِ قدم چھوڑ دیا ہے
کر لیجئے توبہ کا یقیں حضرتِ واعظ
میخانے کو ساقی کی قسم چھوڑ دیا ہے
غفلت مری جانب سے ہے یا ان کی طرف سے
یہ فیصلہ تجھ پر شبِ غم چھوڑ دیا ہے
اس دور کا ہر شاعر نازک ہے سپاہی
تلوار سنبھالی ہے قلم چھوڑ دیا ہے!

جب فنا صاحب نے غزل ختم کی تو صدر محترم نے دوسری غزل سُنانے کی درخواست کی۔ جناب فنا اس خصوصی درخواست سے بہت خوش ہوئے۔ جھک کے کئی دفعہ سلام کیا اور فرمایا۔ "میرا دل جانتا ہے کہ میرے پاس اس درخواست کی کیا قدر ہے۔ میں اگر صدر محترم یا کارکنان مشاعرہ کی مدح سرائی نہ کروں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں ان کے کارہائے نمایاں سے چشم پوشی کر رہا ہوں بلکہ بہت سی باتیں محسوس کی جاتی ہیں کہی نہیں جاتیں۔ ماورائے سخن بھی ایک بات ہوتی ہے"۔ اس تمہید کے بعد فنا صاحب نے ایک ایسی غزل

سنائی جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس موقع کے لئے ہی کہی گئی ہے۔ مطلع کا پہلا مصرعہ تو بالکل مقتضائے حال ہو گیا اس لئے مطلع کو بار بار پڑھوایا گیا۔

ناامیدی میں اک آسرا مل گیا!
دل کو غم کیا ملا حوصلہ مل گیا
حسن ساقی کی اللہ رے سادگی
بس یہ سمجھا کہ اک پارسا مل گیا
راہ دیر و حرم کتنی مسدود تھی
میکدے سے نیا راستہ مل گیا
یہ جنوں کی محبت بھی کیا چیز ہے
دل لگی دل لگی میں خدا مل گیا
اے نگاہ کرم تو پشیماں نہ ہو
مجھ کو میری طلب سے سوا مل گیا
میری غیرت نے وہ راہ بھی چھوڑ دی
جس میں دھندلا سا بھی نقش پا مل گیا

ارباب فہم نے جناب فنا کے اس شعر پر بہت داد دی۔ جناب فنا نے آخری شعر سنایا۔

اور بھی حسن میں دل کشی آ گئی
جب سے شوخی میں رنگ حیا مل گیا

جناب فنا کے بعد جناب ناوک بلائے گئے۔ انہوں نے دو غزلیں سنائیں جن میں کے کچھ اشعار ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

وہ نوکری میں کبھی پھول پھل نہیں سکتا
جو ایک سانس میں بکرا نگل نہیں سکتا
جہاں میں کام شرافت سے چل نہیں سکتا
کہ سیدھی انگلیوں سے گھی نکل نہیں سکتا
کچھ اس طرح سے دبو چاہے دل کو دنیا نے
کہ مارے ڈر کے یہ بچہ مچل نہیں سکتا
جو دودھ ڈبے کا پی کر بڑا ہوا ناوک
وہ والدین کی سیرت پہ چل نہیں سکتا

(۲) سیدھی طرح سے بات کریں کیوں کسی سے ہم
قالین پر اچک کے گئے ہیں دری سے ہم
کھاتے نہیں تھے دھونس کہیں پر کسی سے ہم
اس واسطے چھڑائے گئے نوکری سے ہم
پہنچا دے دھیرے دھیرے جو ٹی بی کے ہسپتال
کرتے نہیں ہیں ایسی محبت کسی سے ہم
اک ذات ہو کے کرتے ہو آپس میں دھڑ ٹیک
جس آدمی سے تم ہو اسی آدمی سے ہم

ناوک صاحب کے شعر چونکہ عام مذاق کے ہوتے ہیں اس لئے آپ کی بڑی قدر دانی ہوی آپ سے کلام سننے کے لئے اکثر سامعین بے تاب رہا کرتے تھے۔

ناوک صاحب کے بعد صدر محترم نے جناب شوق سہرائچی سے کچھ ارشاد فرمانے کی درخواست کی۔ رات کا کافی حصہ بیت گیا تھا محفل کے اکثر لوگوں پر غنودگی طاری تھی۔ شوق صاحب پہلے ہی بیماری کی وجہ سے کافی مضمحل تھے، پھر جاگتے رہنے کی وجہ سے آپ کی آواز اور زیادہ خستہ ہو گئی۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کا کلام واضح طور پر سن نہ سکے۔

جناب شوق اپنی جگہ پر واپس آ گئے اور جناب خبر بہورودی بہ اجازت صدر مائیک کے سامنے آ گئے اور شمالی ہند کے شعراء کی جانب سے صدر محترم اور اراکین سیمینار کا شکریہ ادا کیا۔ پھر ڈاکٹر صاحب قبلہ

ارشاد فرمایا: "اب مشاعرے کا اختتام ہے۔ میں صرف دو لفظ عرض کئے دیتا ہوں۔ مجھے شعرائے کرام کے ساتھ ان کارکنوں اور دانشوروں کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جو دن رات ایک کرکے کام میں معروف رہے اور بڑی محنت وجانفشانی سے اس مشاعرے کو کامیاب بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ خدا ان نوجوانوں کی محنت میں اور برکت دے۔

آپ نے جس "بذذوق" کا اعلان فرمایا تھا یعنی مشاعرہ نثر پر ختم نہیں ہونا چاہیئے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ مولانا انور صابری اپنے کلام سے مشاعرے کا اختتام فرمائیں گے۔

مولانا انور صابری پھر اسی وجد وکیف کے عالم میں تشریف فرما ہوئے۔ تمہیداً کچھ جملے ارشاد ہوئے۔ آخری جملہ ہمیں بھی یاد ہے اس لئے لکھے دیتے ہیں۔ "میں جانتا ہوں کہ ماورائے سخن بھی ایک بات ہے۔ مگر جب سخن ہی درمیان سے اٹھ جائے تو ماورائے سخن کا کون اندازہ کر سکے۔ پھر ارشاد فرمایا

اس دنیا کے میخانے میں پینے کا مزہ وہ پاتا ہے!
جو توڑ کے اپنا جام وسبو خود جام وسبو بن جاتا ہے
تم شورش وہنگامہ نہ بنو بن جاؤ رات کا سناٹا
جو دھیرے دھیرے بڑھتا ہے اور دنیا پر چھا جاتا ہے،

مولانا نے اس تشبیہ میں ندرت تو ظاہر فرمائی مگر ہم مولانا کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ تشبیہ مرغوب نہیں۔ اس قطعہ کے بعد ایک شعر ارشاد فرمایا۔

رازدارانِ دلِ بے تاب کہاں سے لاؤں
عشق کے محرمِ اسرار کہاں سے لاؤں

اختتاماً مولانا نے وہ شعر ارشاد فرمایا جو آپ اکثر مشاعروں میں ارشاد فرماتے رہتے ہیں۔

آؤ ہم مل کے کریں طور کی بجلی تقسیم
نور تو تم میں رہے اور تڑپ ہم میں رہے،

گو رات بہت بیت گئی تھی، پھر بھی حاضرین مشاعرہ میں برابر جمے بیٹھے رہے۔ جب ان پر یہ ظاہر کیا گیا کہ مشاعرہ ختم ہو چکا تو گویا خواب سے جاگے اور بادلِ ناخواستہ آہستہ آہستہ اٹھنے لگے۔ سیمینار کے سالانہ مشاعرے کچھ اس طرح کامیاب ہوتے آئے ہیں کہ ہر مشاعرہ یادگار ہو جاتا ہے چنانچہ اس مشاعرے کی بھی یہی کیفیت رہی۔ ہم نے جہاں تک غور کیا، ہر دل میں انبساط پایا اور ہر چہرے سے فرحت کے آثار نمایاں دیکھے۔





جانب: منتظرین آئی۔ای۔ڈی کا سرٹیفکیٹ
حاصل کر







جناب ثنا نظامی اپنی خوش الحانی اور اپنے پرمعنی اشعا
ے سامعین کو مسحور فرما رہے ہیں۔

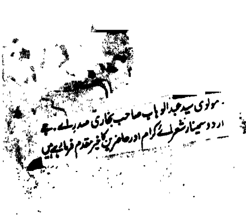
ناوک لکھنوی اپنے تیر و نشتر اشعار کی صورت میں
پیش کر رہے ہیں۔



جناب سلیمان اریب ایڈیٹر صبا اپنا کلام سنا رہے ہیں



اردو سیمنار کا چوتھا سالانہ مشاعرہ



۔ مولوی سید عبدالوہاب صاحب بخاری صدر بلدیہ
اردو سیمنار شعرائے کرام اور حاضرین کا خیر مقدم فرما رہے ہیں



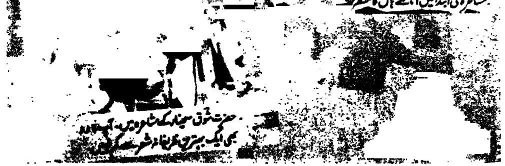
۔ جناب شاہد صدیقی حیدرآبادی اپنے کلام سے حاضرین
کو محظوظ فرما رہے ہیں۔



۔ حضرت انور صابری قبلہ عالم جذب و کیف میں
اپنے اشعار شاداب سے سامعین کو مستفیض فرما رہے ہیں

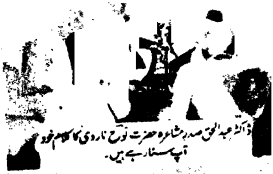


۔ مشاعرہ کی ابتدا میں اسمبلی ہال کا منظر

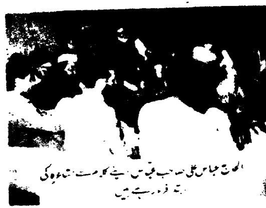


۔ حضرت شوق سیمنار کے مشاعرہ میں [illegible]
بھی ایک بہترین [illegible]

اے جے۔ اردو سیمینار کا چوتھا سالانہ مشاعرہ



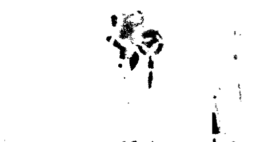
ڈاکٹر عبدالحق صدر مشاعرہ حضرت نوح ناروی کا کلام خود آپ سنا رہے ہیں۔



الحاج عباس علی صاحب عباس [illegible] مشاعرہ کی [illegible] فرما رہے ہیں



[illegible]



[illegible]

He is a Professor of Urdu in the University of Moscow. Despite the fact that Urdu is a foreign language to him the Professor has acquired enough fluency in this language. On the 21st December, 1956, he visited our Seminar in response to our invitation. He was given a very warm reception by the Executive Committee and the members of the Seminar. Addressing them, he mentioned the names of all those Urdu works which have been translated into the Russian language. He was informed of those Urdu books which were the translations of the Russian books. The Professor presented a volume to the Seminar library in token of their good will, which was gladly received with many thanks. Later he endorsed the following lines in the " Visitors Book " in Urdu

" It gives me great pleasure that I came to this library to peruse the books. I am quite confident that having learnt the Urdu language, we can very well acquaint ourselves with the Indian culture."

Along with the Professor, one Mr F. Andrei, a student of the Moscow University, had also come. He had knowledge of the Hindi language. He inscribed the following in the Nagari script in " the Visitors' Book ".

" I hope that by the time we meet next I would be able to write in the Urdu language "

The visit of His Highness Chattari : His Highness Mr. Ahmed Sayeed, the Nawab of Chattari, was in Madras in the month of December, 1956, in connection with the Muslim Convention. On the 23rd December, 1956, accompanied by Dr. Abdul Haq, he was gracious enough to come and see the Seminar. Acquainting himself with the various activities of the Seminar he wrote the following in the " Visitors' Book ".

" I was very happy to see this institution. Madras is doing much service to the Urdu language. I congratulate its founder Jalaluddin Sahib, and I am obliged to him for serving my language in Madras ".

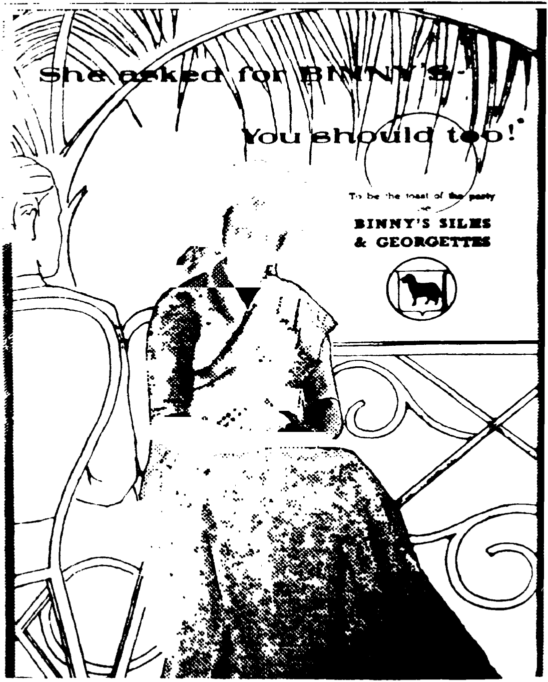
"I have nothing but praise and admiration for the great work that Mr. Jalaluddin is doing for the educational advancement of the younger generation of our people. His service to the cause of Islam and the country is very great and it is an example which is worthy of emulation by every one who is blessed with wealth and the means to render service. The school established by him in the name of his father of revered memory has made wonderful progress and he deserves every congratulation for the devotion and sacrifice he is displaying in serving the greatest need of the hour, *viz.*, religious and secular education of the future citizens of our motherland.

May God bless Mr. Jalaluddin and his compatriots with all that is best in this life and the hereafter.

Professor Agha Hyder Hussain Mirza of Delhi.

" This day is a happy day for me as I have been invited by the Urdu Seminar for the function. Mr. Jalaluddin is an example for the young men of India, who has so very well instituted a memoir in honour of his father, such that as long as this language survives in India, this memoir will exist and the soul of his late father will rest in peace. His advisors too are worthy of praise for having given a very good suggestion and even his friends are to be congratulated for lending support to a good cause. I pray to God for the realisation of the aims and purposes. The hall was full of small girls and boys who were studying there. Lucky is that locality where such good work is being done. It is my heartfelt prayer and desire that this institute of Urdu meets with great success. May all those Urdu speaking people and those desirous of a United India feel proud of this institution and pray for invoking God's mercy on late Zainulabdeen Sahib, Afzal-al-Ulama Dr. Abdul Haq Sahib who is the Sir Syed of the present time and Prof. Syed Abdul Wahab Bukhari Sahib May God bless them with health to do silent service to their country and their country-men and for guiding young men. May God bless all concerned with longer life and greater success (Ameen)."

Visit of the Russian Professor: An educational exhibition was held in December, 1956, in the city of Madras by the Government of Russia. Among the organizers of this exhibition there was one Mr. Gornauff, a well known educationist of Russia.


She asked for BINNY'S
You should too!
To be the toast of the party
BINNY'S SILKS
& GEORGETTES

So whispered Gabriel to me
On the day of creation bright
" Do not my friend, O! do not
Accept the heart that blindly does
Follow the dictates of wisdom.
Do not be lost in the worship of the world,
And accept the dole of warmth ;
Give, instead, your own melt and mould

"I earnestly pray to God to accept the services of these young men ".

On the 12th of December, 1956, Dr. M. Nizamuddin, Retd. Professor of Persian and the President of the Department of Islamic History and Culture. Osmania University, Hyderabad (Deccan), graced the Seminar in the company of Prof Abdul Khader Sarvari of Hyderabad, Deccan. On that occasion, the young students of Madrasa i Zainulabdeen were taking lessons in Arabic, which impressed the learned visitors very much. Dr. Nizamuddin wrote the following words in the Visitors' Book

" It gives immense pleasure to know that Jalaluddin Sahib, a young man of our country, has instituted this library and Madrasa in memory of his revered father Recitation of the Holy Quran and religious instruction of the innocent children and transcription of Arabic language appealed to me very much. The system of schooling given here is that of the Nizamiah Madrasa of Baghdad and Neshapur fame, which is very essential for our country and more so for the reform of Muslims It gave me additional pleasure to learn that " Fanoos i-Khayal " is also a product of this institution, which embalms in it the writings of eminent authors. I congratulate the organizers of this institution. It is a praise-worthy institution for the city of Madras."

It has been stated above that on the Annual Day of the Madrasa–i–Zainulabdeen the Hon'ble Mr. Justice Basheer Ahmed Sayeed and Professor Agha Hyder Hussain Mirza had graced the occasion. After the conclusion of the function, both of them were pleased to record their impressions of the activities of the Seminar in the Visitors' Book, which we are glad to publish here.

The Hon'ble Mr. Justice Basheer Ahmed Sayeed :

Janab Hamidul Ansari Sahib Ghazi, Editor, "Jamhuriath Weekly" of Bombay, during his recent visit to Madras, paid a visit to the Seminar on 24th October, 1956, in the company of Mr. Mohtisham Abdul Ghani, Member of our Auxiliary Committee. Having seen the valuable collection of the Seminar Library and having come to know of the various activities of the Seminar, he recorded the following impressions in the Visitors' Book.

"Guided by brother Mohtisham Abdul Ghani I reached the literary centre of the A. J. Urdu Seminar. My best wishes to those people who are responsible for the foundation of the Seminar. Regards to those on whom the rise and success of this literary institution depends! In South India, and more particularly in a city like Madras, such work is being done, of which, once Delhi and Lucknow were proud. To-day, Delhi and Lucknow of the past are no more, and in such a state of affairs, Madras holds high the torch of literacy."

"Words are inadequate to express appreciation of the work of A. J. Jalaluddin Sahib. A time will come when this institution will give guidance to North India and Madras will become the centre of the Urdu language. All the members of the institution are sincere and earnest, and they deserve all praise."

On 27th October, 1956, Moulvi Alhaj Imran Khan Sahib Nadvi visited the Seminar Library. He made the following observations in the Visitors' Book.

"I happened to attend the A. J. Urdu Seminar of Madras, where I talked to its founder and other members. I was immensely pleased to learn about their activities in the sphere of education. Urdu was befriended in the South by the Father of Urdu, Dr. Abdul Haq Sahib. God bless these young men, who are boldly serving the cause of Urdu in the face of many difficulties. An association of sincere friends and workers for a cause is a great thing. My heart inclines to remind these courageous young men of the message of Iqbal :

Fourth Annual Mushaira : In keeping with the traditions of the Seminar, the 4th Annual Mushaira (*i.e.* a Symposium of Urdu Poets) was successfully conducted in two sessions on the 4th and 5th of January, 1957, at Raja Annamalai Manram. Dr. Alhaj M. Abdul Haq, M. A., D. Phil. (Oxon.) was gracious enough to preside over the Mushaira. Our President, Prof Alhaj Syed Abdul Wahab Bukhari, welcomed all those poets who attended the sessions at our invitation. Besides many well-known poets from the South, some celebrated poets from the North also participated, amongst whom were Allama Anwar Sabiri from Delhi, Janab Fana Nizami from Kanpur, Janab Navak from Lucknow, Janab Khair from Aligadh, Sri Digambar Prasad Gauhar from Delhi, Sri Satish Sahir from Gorakhpur, Janab Ameer from Delhi, Janab Nazeer from Banaras and Janab Ziya Fatehabadi.

Felicitation : We are extremely pleased to inform our readers that our Honourable President, Prof. Alhaj Syed Abdul Wahab Bukhari, is going on a Pilgrimage to Mecca once again. Mr. A. J. Jalaluddin, Founder/Secretary of our Seminar, Mr. F. Z. Ahmed, Executive Committee Member, Mr. Mahfuzul Haq, Auxiliary Committee Member and Janab Alhaj T. R. Abdul Azeem Sahib, a Member of the Seminar are accompanying our President on his sacred pilgrimage In this connection a function was held on 27th March, 1957, at the Seminar Hall to felicitate them under the Chairmanship of Janab K. Abdul Karim Sahib, Vice-President of our Seminar. In his speech, he explained the aims and purposes of this sacred voyage. Janab Safdar Hussain Sahib, M. A., L. T., Adviser of our Seminar, congratulated the guests on their holy intentions and wished them *bon voyage*. Janab Hyder Ali Khan Sahib, M. A., L. T., Adviser of our Seminar and Mr. Habibullah Badsha, M. A., B. L., Asst. Secretary, joined the previous speaker in wishing the guests of the evening a happy journey and safe return. Prof. Alhaj Syed Abdul Wahab Bukhari, on behalf of the Haj party thanked the members of the Seminar and prayed for the well being of the Seminar and its members.

Sri C. K. Subramaniam, B. A (Hons.), Treasurer of our Seminar, proposed a vote of thanks.

The "A Jainulabdeen Shield" Oratorical contest :

Mr. Habibullah Badsha, Assistant Secretary and Director of Literary Activities organised an Oratorical contest on behalf of the Auxillary Committee, on the 8th February 1957 at S.I.E.T. Women's College, Madras. This competition was meant for men and women students of all the Colleges of our State. The following Colleges were represented by two students each.

1. Presidency College, Madras.
2. Government Arts College, Madras.
3. S. I. E. T. Womens College, Madras.
4. Jamal Mohammed College, Trichy.

Professor Syed Abdul Wahab Buhkari presided over the function and Afzal-al-Ulema, Moulvi Rahim Ahmed Sahib Farooqi, M. A., Lecturer in Arabic, Govt. Arts College, Madras, Janab Syed Md. Fazlullah Sahib, M.A., L.T., Lecturer in Urdu, Govt. Arts College, Madras and Mrs. Khurshidunnisa Begum, M. A., L. T., Asst. Lecturer in Urdu, Queen Mary's College, Madras were the judges. The topic for discussion was:

" In the opinion of this house, World Government is essential for the peace and prosperity of mankind ".

The Judges decided that the standard of the contest was very high and the following were the winners .

First Prize :- Miss. Bibijan (S. I. E. T.)— Silver Cup

Second Prize :- Mr. Md. Akhtar Sayeed (Jamal Mohammed) Silver Cup.

Team Prize :- A. Jainulabdeen Rolling Shield was awarded to the S. I. E. T. Womens College, Madras.

The President, Prof. Syed Abdul Wahab Bukhari, congratulated the prize winners of the evening and was glad over the fact that the standard of the contest was very high. He also thanked the judges who were kind enough to accept our invitation in spite of their pressing engagements Mr. Habibullah Basha proposed a vote of thanks.

On this happy occasion we congratulate the S.I.E.T. Womens College, Madras and Jamal Mahammed College, Trichy, on their well deserved success in the contest and look forward to many more colleges participating in future.

Auxillary Committee of our Seminar : To create close contact between the Seminar and such of those enthusiastic young men who showed great interest in the activities of the Seminar, a Committee under the style of the Auxillary Committee was brought into being. Besides Lending active support whenever needed, they have even helped us in presenting a better report this year. The Directors of Literary and Social Activities, Mr. Habibullah Badsha, M. A., B. L., and Mr. Mir-Asad Ali, B. A., respectively deserve more than empty words of praise for their organizing capacities.

Prophet's Day Celebration : On behalf of the Cultural and Social Section of the Auxillary Committeeof the Urdu Seminar, Mr. Mir Asad Ali, Director of Social Activities conducted the Prophet's Day Celebration, which was held on the 9th of November 1956, at the Seminar Hall. Prof. Alhaj Syed Abdul Wahab Buhkari, presided over the function. Sri Nanan Singh, Asst. Collector of Customs, Madras, Prof. N Chandrasekhara Iyer, Curator, Oriental Manuscripts Library, Mr. Habibullah Badsha, M. A., B. L., Asst. Secretary of the Urdu Seminar, Mr. Mohd, Rahamathullah Sait, B.A., and Mr. Mohd. Aminuddin, M. A., (ISL.) M. A., (Hist,) Members of the Executive Committee delivered their speeches commemorating the Great Day.

Sri Nanan Singh cited such of those points of Islam regarding which the present day Government is showing practical appreciation in matters such as widow marriage, property rights of women, prohibition etc. He also said that Prophet Muhammed by his examplary character presented to the world the excellent traits of human nature. He was sure that if Non-Muslims were to go through the Holy Quran and understand it, then misunderstandings which these people have about Islam and its Founder will cease to exist. To prove his statements he quoted the example of Hazrath Omar. In the early stages Hazrath Omar was a strong opponent of Islam and its Founder. But he was a greatly impressed when he heard from his sister a few verses of the Holy Quran and later on accepted Islam.

At the close of the meeting Mr. Mir Asad Ali, B. A., warmly thanked the Chief Guest Sri Nanan Singh, Sri Chandrasekhara Iyer, the other speakers and the audience.

سیمینار کو تشریف لانے والے معزز مہمان



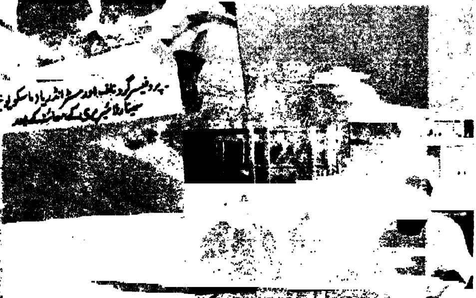
- ہز ہائینس نواب آف چھتاری وزیٹرز بک میں اپنے
تاثرات ثبت فرما رہے ہیں



ڈاکٹر نظام الدین پروفیسر سروری کیساتھ سیمینار ہال میں

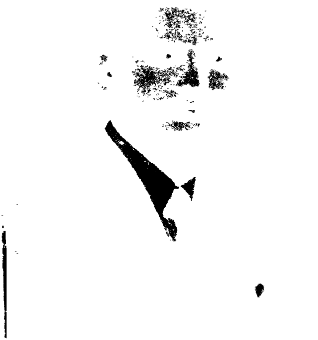


- پروفیسر گرونتلف اور مسٹر انڈریا (ماسکو یونیورسٹی)
سیمینار لائبریری کے معائنہ کے بعد



[illegible] سیمینار لائبریری میں نادر کتب
ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

LIFE MEMBER



J. ABDUL SALAM

Partner, Governor Beedi Factory, Madras

LIFE MEMBER



C. ABDUL GHANI

[illegible] Beedi Factory, Madras

LIFE MEMBER



HASAN ALI DHALA

Hides and Skin Merchant,

Madras.

FIRST PATRON MEMBER



HAJI MALANG HAYATH BASHA

Proprietor: M/s. Malang Trading Co., Madras

Life Members enrolled during the Current year:

1. Mr. Husan Ali Dhala, Hides and Skin Merchant, Periamet Madras.

2. Mr. J. Abdul Salam, Partner, Governor Beedi Factory, Madras.

3. Mr. J. Abdul Ghani, Partner, Governor Beedi Factory, Madras.

We heartily thank all these gentlemen for their generosity in enrolling themselves, and we look forward to others who will show their love for Urdu by following the footsteps of these gentlemen.

With great pleasure and pride we announce that His Excellency Shri Sri Prakasa, the Ex. Governor of Madras and the present Governor of Bombay, who is closely associated with this institution has been pleased to accept our Seminar's Honorary Patronship. The fact that His Excellency has kindly agreed to be the Honorary Patron of the Seminar, speaks of His Excellency's great love for Urdu. The letter our President received from the Secretary to His Excellency is published on the front page of this magazine.

At present the total collection of books in the Library is quite large. Besides the books purchased by the Seminar, some books forming part of the collection come spontaneously from the well wishers of the Seminar. The list of such Donors is as follows :-

(1) Haji M. A. Shukoor Sahib, (2) Janab Kamal Badsha Sahib, (3) Manager, Kithabi Duniya, Lucknow, (4) Janab Abdus Shukoor Sait Sahib, (5) Janab Motisham Abdul Ghani Sahib, (6) Haji Mohd. Abbas Sahib, (7) Janab Nasiruddin Hashim Sahib, (8) Janab S.M. Abdur Rahman Sahib, (9) Janab P. Abdul Khuddus Sahib, (10) Janab Shaik Ahmed Sahib, (11) Janab S. Ibrahim Sahib, (12) Janab K. M. Saleem Sahib, (13) Janab M.M. Murad Ali Sahib, (14) Prof. Hyder Ali Khan Sahib.

We individually thank all of them for their invaluable donation.

The Hon'ble Mr. Justice Basheer Ahmed Sayeed distributed the prizes to the students of the Madrasa. Addressing the gathering he said that in every field of education we should be equally successful. He continued that besides educating men, the education of women should also be on a par.

On behalf of Urdu Seminar Mr. N Mohd. Yousuf, B. A., proposed a vote of thanks.

The following is the list of prize-receipients :

Recitation of the Quran:
1. Abdul Hadi 2. Syed Hifsur Rahman 3. Mohd. Usman

Prayer Song: 1. Syed Amanullah 2. Abdul Quddus
3. Abdul Aleem 4. Rahmathunnisa Begum
5. Hoorunnissa Begum 6. Zeenathunnissa Begum
7. Hasina Begum.

Reading of the Quran: 1. Amanullah 2. Abdul Samad
3. Abdul Quddus 4. Rahmathunnissa Begum
5. Aarifunnissa Begum.

Transcription: 1. Abdul Quddus 2. Khader Mohideen
3. Abdul Hadi 4. Taharunnissa Begum
5. Rahmathunnissa Begum 6. Hoorunnissa Begum.

Attendance: 1. Abdul Hadi 2. Mohd. Usman 3. Safiya Bi
4. Rehana Bi

Infant Class–Efficiency: 1. Khaja Shah Mohd. Nazimuddin
2. Abdul Lateef 3. Sabirunnissa 4. Akhtar Jan.

The Membership of the Seminar:

The current members are 402 in number. With pleasure we announced in our last issue that Mr. Hatim M. Lodhgar was enrolled as our first Life Member. We are glad to submit that many more have joined the membership of our Seminar as Life and Patron Members. This year we are proud to announce that Haji Malang Hayath Basha Sahib, Proprietor, M/s. Malang Trading Co., Periamet, Madras, has been gracious enough to become that first Patron Member of our Seminar.



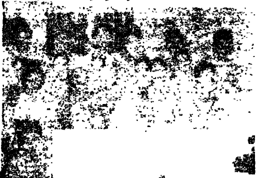
۔سردار نانا سنگھ صاحب سیرت نبوی پر تقریر فرما رہے ہیں

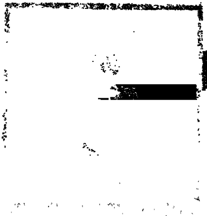


۔پروفیسر چندرا سیکرن۔ ناظم قلمی کتب خانہ حکومت مدراس
اسلامی اور ویدانتی فلسفۂ حیات پر تقریر فرما رہے ہیں۔



۔مدرسہ کی طالبات نعتیہ نظم سنا رہی ہیں۔







مدرسہ زین العابدین کا سالانہ جلسہ







- مولوی سید عبدالوہاب صاحب بخاری صدر مدرسہ ہٰذا، سینیٹر ڈاکٹر عبدالحق، آنریبل جسٹس بشیر احمد سعید صاحب، پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا اور دیگر حاضرین کا خیر مقدم کر رہے ہیں

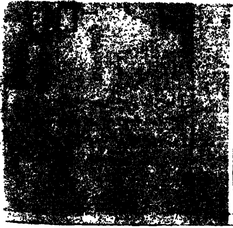


آنریبل جسٹس بشیر احمد سعید صاحب حاضرین کو خطاب فرما رہے ہیں



- مدرسہ کے انعام پانے والے طلباء و طالبات





- پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا اپنی دل آویز تقریر سے حاضرین کو مسحور فرما رہے ہیں



Dr. Alhaj M. Abdul Huq spoke in detail on the various educational services rendered by the Chief Guest.

While Proposing the vote of thanks Mr. Md. Raza Khan, M.L.C., informed the audience that in our own interest it was desirable to reduce our claims from the Government as far as possible and satisfy our needs by endeavouring in our own way.

The Annual Day Celebrations of the "Madrasa-i-Zainulabdeen"

On the 8th November 1956 the Annual Day of the Madrasa was celebrated under the Presidency of the Hon'ble Mr. Justice Basheer Ahmed Sayeed at the Seminar Hall. This Madrasa was established for the study of Arabic and Urdu languages on the 27th August 1954. The function began with a prayer and was followed by the Annual Report read by the Secretary. In his report the Secretary expressed that the Madrasa had employed two teachers who did satisfactory work. There are hundred and seventeen boys and fifty-eight girls in the Madrasa and the records show an average of eighty percent attendance. Besides this, adults are also being educated in the Arabic language. He announced that eight students had completed the study of the Holy Quran during the current year. While concluding the report the Secretary referred to the various privileges made available to the students of the Madrasa and made a general appeal to the public to benefit by joining this Madrasa.

Welcoming the Hon'ble Mr. Justice Basheer Ahmed Sayeed, Prof. Alhaj Syed Abdul Wahab Buhkari narrated to the audience the various educational activities of Mr. Justice Basheer Ahmed Sayeed.

Dr. Alhaj M. Abdul Haq expressed his views on the need and necessity of such Madrasas, and he opined that the number of such Madrasas should increase and more and more persons should acquire benefit from them. In this World of Science due emphasis must be given to Religious education.

Prof. Agha Hyder Hussain Mirza, Ex-Professor of Urdu, Nizam College, Hyderabad, addressed the children of the Madrasa in the most facile and sweet language. He asked the children to learn the lesson of righteousness from History and follow the path of goodness.

ANNUAL REPORT

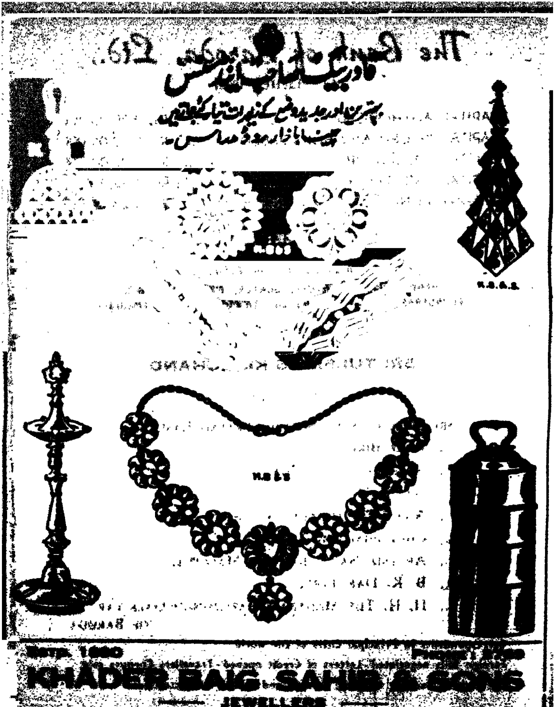
At the very inception of the Fourth Annual Report of the A. J. Urdu Seminar we humbly submit our thanks to the Almighty for having blessed us with guidance and courage in the pursuit of the aims and purposes of our Seminar.

The A. J. Urdu Seminar was founded in memory of the Late A. Jainulabdeen Sahib on the 26th of April 1953. Within a short period of four years, this institution has shown enough advancement in its various activities, by which its workers are extremely encouraged.

Inauguration of the Activities of the Year

The activities of the year under report were inaugurated by Dr. Sir A. Lakshmanaswami Mudaliar, the expert educationist and Vice-Chancellor of the University of Madras. In his inaugural speech he proclaimed that 'If any language were to be popularised in the World, translation is indispensable'. He said that we should translate our best literature in the famous languages of the World enabling the other nations to be acquainted with our literature and we should enrich our literature by the translations of the best literature of other languages. Pointing out the praiseworthy traditions of the Madras University, the learned speaker said that in keeping up with these traditions the University has shown no prejudice against any language. On the other hand it endeavours for the advancement of every language. Therefore he said that the deserving place which Urdu enjoys in the University will continue to remain the same. Incidently he referred to Dr. Alhaj M. Abdul Haq and Professor Alhaj Syed Abdul Wahab Bukhari and thankfully expressed that where Urdu, Arabic and Persian languages were concerned, the University was being benefitted by their valuable advice.

In the beginning of the meeting Professor Alhaj Syed Abdul Wahab Bukhari, President of our Seminar welcomed the Guest of the evening and others.



قادر بیگ صاحب اینڈ سنس
KHADER BAIG SAHIB & SONS
JEWELLERS



The Fourth Annual Celebration was inaugurated by

Lt. Col. Sir A. LAKSHMANASWAMY MUDALIAR

B.A., M.D., LL.D., D.Sc., D.C.L., F.R.C.O.G., F.A.C.S., M.L.C.,

Vice-chancellor of the University of Madras

attention towards those great personalities who have played an important part in the intellectual development of the South.

Biography is entirely different from mere naration of facts. The main purpose of a Biography is to make the reader acquainted with the personality of the person about whom the article is written and this task Dr. Huq Sahib has accomplished. Dr. Huq Sahib had written an enlightening article about Moulana Abdus Subhan Sahib in the Third Annual Number. This year he has chosen to write on the life of the Late Janab Haji Jamal Mohammed Sahib which should prove to be very interesting. Reviving the memories of the past while adhering to the rule of brevity is a remarkable characteristic of Dr. Huq's writings.

We have the unique opportunity of presenting in this issue a very learned article by Janab Syed Abdul Wahab Sahib Bukhari, our President, on the life of that great figure in history- Imam Ghazzali. He has dealt with the subject in a manner which should hold the interest of the readers. This is a further contribution he has made to the intellectual progress of the South.

We have also an article from that eminent poet and writer Janab Zia Fatehabad. His article entitled "Far Southern India" should provide thought provoking reading. Besides we have also a poem about the War of Independence.

Amongst the many valuable contribution we have received this year, special mention should be made of the articles of Sri Ramesh Paul of All-India Radio, Janab Safdar Hussain Sahib and Janab Hyder Ali Khan Sahib. We are thankful to all those gentlemen who have sent their articles, poems etc., and helped us to maintain the intellectual standard of the magazine.

We are very grateful to all the advertisers without whose co-operation this magazine would not have been published. We look forward to their support in the years to come.

We are indebted to Sri Shri Prakasa, formerly Governor of Madras and at present the Governor of Bombay for having graciously consented to be the Honorary Patron of our Seminar. We will always remain grateful for the kindness that he has shown to us. It is with legitimate pride that we have published his photo which adorns the first page of this issue.

We have had a busy year and we hope to keep abreast of the March of Time with the support of all our well wishers and friends.

MARCH OF TIME.

It is a matter of great pleasure that by the grace of God the Fourth Annual Number of the "Fanoos-i-Khayal" is being published at a time when celebrations are going to be held all over the country to commemorate the First War of Independence. It would be no exaggeration to state that the Urdu language was to a great extent influenced by the events which took place in 1857. Besides it also played an important role in the struggle for freedom which had its birth in 1857.

Even before the War of Independence Urdu Journalism had begun, though the tone of the Journals was rather subdued. It was through the medium of these papers that dissatisfaction with the British Government was first expressed, for which Syed Mohammed Baquer (Father of Mohammed Hussain Azad) who led this movement had to sacrifice his life. When one recollects the names of the martyrs who have laid down their lives in the struggle for freedom, one cannot but remember the name of Syed Mohammed Baquer who started this intellectual opposition through the medium of his Journal.

The year 1857 proved to be a landmark in the history of Urdu language. The persian language which till now held sway as the official language had to give place to Urdu which now became the official language. Urdu journalism received the much needed encouragement. Urdu prose which was neglected began to receive attention and it began to play as important a part as Urdu poetry. All these changes contributed to the progress of the language. The progress was so striking that within a hundred years Urdu achieved recognition as one of the progressive languages of the World. Though at present the atmosphere apparently appears to be unfavourable in our country, the language possesses such intrinsic beauty and contains such values that any opposition to it looks insignificant. We are sure that Urdu will triumph over all obstacles and reach the harbour of safety in the not too distant a future.

We consider ourselves extremely lucky to have an article from Janab Dr. M. Abdul Huq Sahib even this year. No words could do justice to the extraordinary work he is doing in the sphere of intellectual activity in the South. He has now turned his [illegible]

OUR OFFICE BEARERS.



Seated (L to R):—A. J. Jalaluddin Sahib, B.A., (Secretary); Hyder Ali Khan Sahib, M.A., L.T., (Adviser); K. Abdul Kareem Sahib, (Vice-President); Moulvi Alhaj Syed Abdul Wahab Sahib Bukhari M.A., L.T., (President); Safdar Hussain Sahib, M.A., L.T., (Adviser); Habibullah Badsha Sahib M.A., B.L., (Asst. Secretary); C. K. Subramaniam Esq, B.A. (Hons.), (Treasurer);

Standing 1st Row (L to R):—G. A. Hameed Sahib (E.C.M.); Md. Rahmathullah Sait Sahib B.A. (E.C.M.); F. Z. Ahmed Sahib (E.C.M.); M. A. Sattar Khan Sahib (A.C.M.); A.A. Aleem Sahib (E.C.M.); Mir Asad Ali Sahib B.A., (A.C.M.); S. Yaseen Baig Sahib, (A.C.M.);

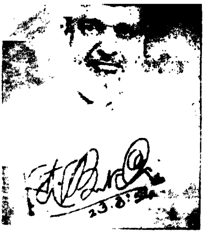
,, **2nd Row (L to R):**—K.M.M. Farooqi Sahib, (Librarian); Malang Hayath Badsha Sahib (A.C.M.); S. Md. Azmathullah Sahib B.A., (E.C.M.); Md. Aminuddin Sahib M.A., (E.C.M.); Haji M. Mehfuz-ul-Huq Sahib (A.C.M.); N. Mohd. Yousuf Sahib B.A., (E.C.M.).



Dr. Alhaj Moulvi
M. ABDUL HUQ SAHIB, M.A., D. Phil. (Oxon.),
FIRST MEMBER
Public Service Commission, Madras

PRESIDENT

FOUNDER SECRETARY



Alhaj Moulvi
SYED ABDUL WAHAB SAHIB
BUKHARI, M.A., L.T.,
Professor of Islamic History & Culture,
Presidency College, Madras



Janab A. J. JALALUDDIN SAHIB, B.A.,
of
M/s. A. Jainulabdeen Sahib,
Snuff Manufacturers,
Madras

In Revered Memory of



Late A. Jainulabdeen Sahib

the A J. Urdu Seminar was instituted.

No.G.S.- /040
Raj Bhavan,
Malabar Hill,
Bombay 6.
March 26,1957.

Dear Sir,

Referring to your letter dated the 2nd February,1957, I am to say that the Governor is pleased to agree to be an Honorary Patron of the A.J.Urdu Seminar, Madras.

Yours faithfully,

A.T.Bambawale

(A.T.Bambawale)

Prof.Alhaj S.Abdul Wahab Sahib Bukhari, M.A., L.T.,
President, A.J.Urdu Seminar,
No.1, Parish Venkatachella Iyer Street,
Madras-1.

No.G.S.-/241
Raj Bhavan,
Malabar Hill,
Bombay 6.
April 8,1957.
10

Dear Sir,

Referring to your letter dated March 27,1957, the Governor has asked me to send his good wishes for the success of the Annual Number of A.J.Urdu Seminar which you are bring out on the 15th instant.

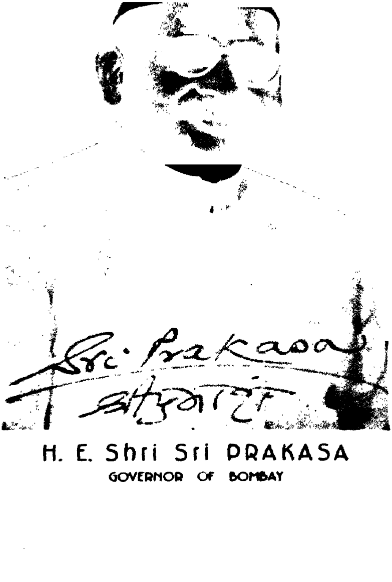
Yours faithfully,

A.T.Bambawale

(A.T.Bambawale)

Shri A.J.Jalaluddin, B.A.,
Secretary, A.J.Urdu Seminar,
No.1, Parish Venkatachella Iyer Street,
Madras-1.

Honorary Patron



H. E. Shri Sri PRAKASA

GOVERNOR OF BOMBAY

OFFICE BEARERS OF THE URDU SEMINAR.

President :

Prof. Alhaj Syed Abdul Wahab Sahib Bukhari, M.A., L.T.

Vice President :

Janab K. Abdul Karim Sahib.

Advisers :

Janab Safdar Hussain Sahib, M.A., L.T.
Janab Hyder Ali Khan Sahib, M.A., L.T.

Secretary/Convener :

Janab A. J. Jalaluddin Sahib, B.A.

Asst. Secretary :

Janab Habibullah Badsha Sahib, M.A., B.L.

Treasurer :

Sri. C. K. Subramaniam, B.A., (HONS.).

Members of the Executive Committee :

Janab F. Z. Ahmed Sahib.
Janab A. A. Aleem Sahib.
Janab G. A. Hamid Sahib.
Janab Mohamed Aminudin Sahib, M.A. (Isl. Hist.), M.A. (Hist.)
Janab S. Mohamed Azmadullah Sahib B.A.
Janab Mohamed Rahmadullah Sait Sahib, B.A.
Janab N. Mohamed Yousuf Sahib, B.A.

Curator :

Janab A. A. Aleem Sahib.

Librarian :

Janab K. M. M. Farooqi Sahib.

A. J. URDU SEMINAR, MADRAS-1 (ESTD. 1953)

FANOOS-I-KHAYAL

(FOURTH ANNUAL REPORT)

1957

★

EDITOR: A. J. JALALUDDIN, B.A.

★

PUBLISHERS:

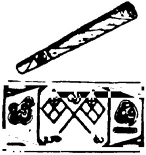
A. J. URDU SEMINAR,

No. 1, P V. Iyer Street,

MADRAS-1, (S. INDIA).

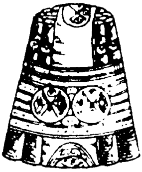
USE ALWAYS

BAVUTA BEEDIES



Regd. No. 86896





Regd. No.
82978



Bavuta Beedies are made in Our Factory under our direct supervision by very competent workmen from the Choicest Aromatic Nipani, Surat & Mysore tobacco of the first quality.

Shaik Ismail & Son, Washermanpet, Madras 21.

